مونوگراف
راجندر منچند ابانی
عمیر منظر

مونوگراف

راجندر منچندا بانی

عمیر منظر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

پہلی اشاعت	:	2016
تعداد	:	550
قیمت	:	-/76روپئے
سلسلۂ مطبوعات	:	1872

Rajinder Manchanda Baani

By: Umair Manzar

ISBN :978-93-5160-106-7

ناشر: ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی110025، فون نمبر:49539000، فیکس:49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر:26109746

فیکس:26108159 ای۔میل:ncpulsaleunit@gmail.com

ای۔میل:urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ:www.urducouncil.nic.in

طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس، C-7/5، لارنس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔110035

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

ہمارا دور بھی عجیب ہے ایک طرف جہاں اردو زبان کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے تو دوسری جانب دوریاں نزدیکیوں میں تبدیل ہوتی جا رہی ہیں۔ جدید تکنیکی انقلاب نے معلومات کے سمندر کو کوزے میں سمیٹ کر ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے ایسے میں اس خوف کا دامنگیر ہونا خلاف واقعہ نہیں کہ ہمارا قدیم و کلاسیکی ادب اس تکنیکی طلاطم کا شکار نہ ہو جائے۔

اپنے نابغہ ادیبوں و شاعروں پر مونوگراف لکھوانے کے اس نئے سلسلے کا آغاز اسی لیے کیا گیا ہے تا کہ ہم نئی نسل کے سامنے کم سے کم صفحات میں معروف ادبا کا سوانحی خاکہ بھی پیش کر سکیں اور ان کی تحریروں کے منتخب نمونے بھی۔

قومی کونسل نے اس سلسلے میں موجودہ اہم اردو قلمکاروں کی خدمات حاصل کی ہیں اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم قارئین کو براہ راست اپنے اس تجربے میں شامل کریں۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اہم ادیبوں پر مونوگراف شائع کر دیں اور یہ بھی کوشش ہے کہ یہ مونوگراف معلومات کا ذخیرہ بھی ہو، اب اس معیار کو ہم کس حد تک حاصل کر سکے اس کا فیصلہ آپ کریں گے لیکن آپ سے یہ گزارش ضرور ہے کہ اپنے قیمتی مشوروں سے ہمیں ضرور نوازیں تا کہ ہم آئندہ ان مشوروں کو نشانِ منزل بنا سکیں۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈائرکٹر

فہرست

ابتدائیہ

جدید غزل کے ابتدائی دنوں میں جن شعرا نے اپنی انفرادیت قائم کی ہے، ان میں ایک اہم نام راجیندر منچندا بانی کا ہے۔ اردو شعر و ادب کی بالعموم اور جدید غزل کی بالخصوص یہ بدقسمتی ہی کہی جائے گی کہ اس رجحان سے وابستہ بہت سے اہم فن کار کم عمری ہی میں انتقال کر گئے۔ ناصر کاظمی، شکیب جلالی، زیب غوری اور بانی کا شمار اردو کے جواں مرگ شاعروں میں ہوتا ہے۔

بحیثیت جدید غزل گو بانی کا جو مقام و مرتبہ ہے اس کو ہمیشہ تسلیم کیا گیا ہے لیکن بانی کی شاعری کے بارے میں ابھی تک کوئی ایسا تفصیلی مطالعہ ہمارے سامنے نہیں آیا جس سے ان کی قدر و قیمت اور مرتبے کا معروضی انداز میں تعین کیا جا سکے۔ بانی پر مضامین کی کمی نہیں لیکن زیادہ تر مضامین تاثراتی انداز کے ہیں۔ چند مضامین بلاشبہ ایسے ہیں جن سے کچھ کچھ بانی کا سراغ ملتا ہے۔ لیکن یہ بھی عقیدت ہی کے زمرے میں آتے ہیں البتہ جناب شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر عتیق اللہ اور جناب عمیق حنفی کے مضامین بانی شناسی کے باب میں نہایت اہم ہیں۔ جدید شعری رویوں اور تجربوں کے ذیل میں بانی کی تخلیقی کاوشوں کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا کلام مختلف حیثیتوں سے اہل نظر کے لیے قابل توجہ رہا ہے۔ بانی کی خوش سلیقگی، لفظوں پر غیر معمولی دسترس اور ان کے اسلوب نے جدیدیت کی شعری تخلیقات کو ایک

واضح پہچان عطا کی ہے۔

پہلا باب بانی کی سوانح پر مشتمل ہے۔اس میں بانی کی سوانح اور شخصیت کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔بانی کی سوانح سے متعلق بہت کم مواد دستیاب ہے۔

دوسرا باب بانی کی غزل گوئی پر مشتمل ہے،جس میں ان کی غزلوں کا تنقیدی محاکمہ و تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔شعری تراکیب،لفظوں کی تکرار اور پیکر تراشی بانی کی تخلیقی کائنات کے اہم اوصاف ہیں۔ان سے ان کے کلام کی معنویت کا سراغ ملتا ہے اور لفظوں کے استعمال میں ہی ان کی خلاقانہ قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔

بانی کی شاعری کے کلیدی الفاظ: ہوا، رات، منظر، عکس، سایہ، دھند، شجر، موسم، خلا، دھواں، وسعت، اڑان، افق، لہو، سمندر، موج، بادبان، کشتی، پرندہ اور سفر کا مطالعہ اور تجزیہ ہمیں ایک ایسی دنیا سے واقف کراتا ہے جہاں ہر قدم پر روحانی اور وجودی اضطراب کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔

شعری علائم بانی کی شعری شناخت کا اہم وسیلہ ہیں،جن سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔بانی کو بخوبی علم ہے کہ انسان کتنی بھی لمبی اڑان بھرے یا زخم خوردہ زندگی سے عاجز آکر راہ فرار اختیار کرنا چاہے بہرصورت اسے بالآخر زندگی کے سنگلاخ حقائق ہی کا سامنا کرنا ہے،ان سے مفر ممکن نہیں ہے۔

بانی نے پرندے کی علامت سے معنوی پرواز کے آسمانوں کی دریافت بھی کی ہے اور پرندوں کی مانند کھلی ہوامیں آزادی کے ساتھ خود بھی اڑان بھرنے کا جتن کرتے نظر آتے ہیں۔

بانی کے علائم ان کی زندگی کے وسیع تجربے اور مشاہدے کی دلنشیں مثالیں ہیں جو اپنی معنویت اور تہہ داری کے سبب گہرے غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔بانی ہمارے ان تخلیق کاروں میں ہیں جو زبان کے نامیاتی کردار سے واقف ہونے کے سبب اس کو تخلیقی طور پر دیگر شاعروں کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور موثر طور پر استعمال کر سکتے ہیں اور اپنی شعری کائنات میں معنی کا چراغاں کر سکتے ہیں۔نئی شاعری کے بالکل ابتدائی دور میں علامتوں،شعری پیکروں اور تراکیب سے اپنی تخلیقیت کا ثبوت وافر فراہم کیا ہے۔

بانی کی غزل دراصل ان کی داخلی محسوسات اور تجربات کی شاعری ہے، اس لیے اس میں استعاروں اور پیکروں کی کارفرمائی زیادہ ہے۔ ان کے اشعار کے اجمالی مطالعہ سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ روایت کا گہرا شعور اور اس سے انحراف کے بعد انفرادیت کا جو رنگ ان کے ہاں پیدا ہوا ہے وہ نئی نئی صورتوں میں سامنے آتا ہے۔ یک گونہ تشنگی اور تبدیلی کا احساس بانی کی مضطرب شاعرانہ روح کا اشاریہ ہے۔

تیسرے باب میں بانی کی نظم نگاری کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔ بانی کی شہرت اور شناخت غزل سے ہے مگر ان کی نظموں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نظمیں منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے نہیں ہیں، بلکہ یہ تخلیقی مرحلہ میں نئے سمتِ سفر کی غماز ہیں۔ فن اور فکر کی بہت سی جہتیں نظموں کے حوالے سے بھی روشن ہوئی ہیں۔ بانی کی نظموں میں ندرت فکر وفن کی صورت حال پر میں نے کچھ اشارے کیے ہیں۔ امید ہے کہ اس مطالعہ کے بعد اہل نظر بانی کی نظموں پر توجہ دیں گے۔

چوتھے باب میں بانی کے اُن اشعار کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے جن کی بنیاد انسانی تعلقات پر ہے۔ بالعموم شعرا کے یہاں لحۂ وصل کا بیان ملتا ہے۔ تاہم بانی پیش پا افتادہ مضامین سے کم ہی سروکار رکھتے ہیں۔ وہ رشتوں کو وسیع تر تناظر میں دیکھتے ہیں جن کا یہاں مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اسی لیے اس باب کا عنوان 'ٹوٹتے رشتوں کا شاعر' رکھا گیا ہے۔

پانچویں باب میں بانی کی انفرادیت کو ان کے مختلف اشعار کی روشنی میں اجاگر کیا گیا ہے۔ اس مطالعہ سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بانی کی شاعری پرقوت ہے۔ جس میں آئندہ زمانوں میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہے۔

چھٹے باب میں بانی کی نثری خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ بانی کا تعلق ادبی صحافت سے بھی تھا نیز ان کے کئی مضامین متعدد ادبی رسالوں میں شائع ہوئے تھے۔ اس باب میں ان تمام مباحث کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

آخری باب بانی کے نایاب کلام پر مشتمل ہے۔ قدیم ادبی رسائل سے دستیاب کلام کی روشنی میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بانی فن کے تئیں کس قدر حساس تھے اور کس طرح وہ اپنے کلام پر نظر ثانی کے بعد اسے بہتر بنانے کے لیے سرگرم رہتے تھے۔

یہ میرا نہایت خوش گوار فریضہ ہے کہ میں اپنے اساتذۂ کرام، کرم فرماؤں کی عنایتوں اور احباب کے تئیں جذبات تشکر پیش کروں جنھوں نے اس کتاب کی تیاری میں قدم قدم پر اپنی معاونت سے نوازا۔

عمیر منظر

شخصیت وسوانح

راجندر منچندا جو بانی کے نام سے اردو شعروادب میں جانے جاتے ہیں، تقسیم وطن کے نتیجے میں ہندوستان آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ دلی شہر کو اپنا مسکن بنایا۔ اگر چہ ابتدائی ذہنی وجسمانی نشو ونما ملتان میں ہوئی مگر شعور نے دہلی میں آنکھیں کھولیں۔ کسے معلوم تھا کہ ملتان کی خاک سے اٹھنے والا یہ انسان اردو شعروادب بالخصوص جدید غزل کا ایک ممتاز رجحان ساز شاعر بن کر ابھرے گا۔

بانی کا خاندانی پس منظر بھی ایسا نہیں تھا کہ اس طرح کی توقعات ان سے وابستہ کی جاتیں۔ تقسیم کے نتیجے میں لاکھوں انسانوں کی بے گھری اور دربدری سے مایوسی اور کشمکش کی جو عام فضا پیدا ہوگئی تھی اسے دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل تھا کہ ایسے پر آشوب دور میں پرورش پانے والا یہ شاعر جدید غزل کا معتبر وسیلہ قرار پائے گا۔

راجندر منچندا بانی 12 نومبر 1932 کو ملتان (موجودہ پاکستان) میں پیدا ہوئے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ۔

چار چیز است تحفۂ ملتان
گرد و گرما، گدا و گورستان

راوی اور چناب جیسے دریاؤں سے سیراب ہونے والا یہ علاقہ کافی مردم خیز رہا ہے۔ اسی سرزمین سے سوامی ہری داس (تان سین کے استاد) پید ہوئے۔ نندلال گویا، شاہ حسین اور عبدالعزیز خالد کا تعلق بھی اسی خطے سے ہے۔ یہ شخصیات اسی سرزمین کا حصہ رہیں۔ البتہ بانی

اوائل عمری میں ہی تقسیم وطن کے نتیجے میں دہلی آ گئے۔ بانی کے والد کا نام لالہ گوبند رام منچندہ تھا۔ وہ دہلی کے ایک سرکاری اسکول میں استاد تھے اور پرنسپل کے عہدے سے اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش ہوئے۔ بانی کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے ملتان ہی میں حاصل کی۔ دہلی آ کر انھوں نے معاشیات میں ایم اے کیا اور یہیں ایک ہائر سکینڈری اسکول میں استاد ہو گئے۔ رام پرکاش راہی نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ:

''شعرا کے ایک اجتماع میں بانی نے ایک غزل پڑھی جس کے دو مطلعے اور دو شعر خاص کر قابل ذکر ہیں ؎

تمام راستہ پھولوں بھرا ہے میرے لیے
کہیں تو کوئی دعا مانگتا ہے میرے لیے
تمام شہر ہے دشمن تو کیا ہے میرے لیے
میں جانتا ہوں ترا در کھلا ہے میرے لیے

1۔ دریائے راوی ملتان کے قدیم قلعے کے پہلو میں بہتا تھا اور اسے بندرگاہ کی حیثیت حاصل تھی۔ ملتان کو اصل شہرت 712 میں ملی جب محمد بن قاسم نے یہاں حملہ کیا۔ مشہور صوفی بزرگ بہاء الدین زکریا کا تعلق اسی سرزمین سے رہا۔ علمی اور تجارتی دونوں اعتبار سے اس شہر کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ گرما، آم، ہاتھی کے دانت کی چوڑیاں، آرائشی سامان اور ملتانی سوہن حلوہ بہت مشہور ہیں۔ ایک راگ بھی ملتان کے نام سے مشہور ہے جسے 'ملتانی راگ' کہا جاتا ہے۔ ملتان کی مادری زبان سرائیکی ہے جسے تہذیب و ثقافت کے کئی رنگوں میں اور کئی لوک فن کاروں کی آواز میں سنا جا سکتا ہے۔

وہ ایک عکس جو پل بھر نظر میں ٹھہرا تھا
تمام عمر کا اک سلسلہ ہے میرے لیے
گزر سکوں گا نہ اس خواب خواب بستی سے
یہاں کی مٹی بھی زنجیر پا ہے میرے لیے

داد و تحسین کے علاوہ خاص بات یہ ہوئی کہ جناب سکندر علی وجد نے سوال کیا ''عزیزی تم کہاں کے رہنے والے ہو؟'' بانی نے بتایا کہ ''فی الحال

تو میں دہلی میں رہ رہا ہوں'' لیکن آپ کا مطلب اگر میں نے ٹھیک سمجھا ہے تو عرض کروں گا کہ میرا جنم پیروں فقیروں کے مشہور شہر ملتان میں ہوا تھا اور یہ 12 نومبر 1932 کی بات ہے وہیں پہ لگ بھگ زندگی کے پندرہ سال گزارے۔ تقسیم ملک کے بعد دہلی آ گیا اور یہیں پہ اپنی تعلیم مکمل کی۔'' (مضمون بعنوان: بانی حرفِ معتبر سے شفق شجر تک، رام پرکاش راہی، ایوان اردو ستمبر 1988)

بانی نے تین یادگار شعری مجموعہ چھوڑے۔ پہلا مجموعہ 'حرف معتبر' 1971 میں شائع ہوا، جبکہ 'حساب رنگ' کی اشاعت 1976 میں ہوئی اور آخری مجموعۂ کلام 'شفق شجر' پس از مرگ 1983 میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔

دہلی کی ادبی وشعری فضا میں بانی کے کلام کو بہت جلد اعتبار حاصل ہو گیا تھا۔ چنانچہ بہت کم عرصہ میں ان کی ایک خاص شعری شناخت بن گئی تھی۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ شعروادب کی طویل اور بے لوث خدمت کے باوجود آج بانی کو جاننے اور سمجھنے کے لیے قابل ذکر مواد موجود نہیں۔ ان کے شعری مجموعے تقریباً نایاب ہو چکے ہیں۔ ان کی شخصیت اور شاعری سے متعلق صرف چند مضامین ہیں، جو ان کے دوستوں اور قریبی تعلق رکھنے والوں نے خاص مواقع کے لیے لکھے تھے۔

بانی کا شمار اردو کے جواں مرگ شاعروں میں کیا جاتا ہے۔ 48 برس کی قلیل مدت میں بانی نے شاعری کی شکل میں جو منتخب کلام اردو دنیا کے سپرد کیا، وہ نئی غزل کے سرمایے میں صرف اضافہ ہی نہیں بلکہ ایک سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ بانی کو اس دنیا سے رخصت ہوئے ربع صدی ہونے والی ہے مگر ان کی شاعری آج بھی امکان واثر کے خزانوں سے مالا مال ہے۔ بانی کے تینوں مجموعۂ کلام 'حرف معتبر'، 'حساب رنگ' اور 'شفق شجر' کے ابتدائی صفحات پر بانی کا اصل نام، تاریخ پیدائش، تعلیم اور وطن کا خصوصیت سے ذکر ہے۔ اس کی رو سے بانی کا اصل نام راجیندر منچندہ ہے، جن کی پیدائش پاکستان کے ملتان شہر میں 12 نومبر 1932 کو ہوئی۔ تعلیم کے

خانے میں ایم اے اقتصادیات درج ہے۔ 11 اکتوبر 1981 کو طویل علالت کے بعد بانی کا انتقال ہو گیا۔ بانی کے پس ماندگان میں بیوہ ساوتری دیوی، بیٹی انوشری کمار اور بیٹا منچندا بانی ہیں۔
'فن اور شخصیت' کے غزل نمبر میں بانی نے خود اپنے بارے میں لکھا ہے:

> دوسری جنگ عظیم کے بعد 1945 میں، میں نے اردو شاعری سے اپنا رشتہ جوڑا۔ اردو کی نصابی کتب میسر نہ آئی۔ میر اور غالب کے مطالعہ سے تربیت ملی اور پھر محبت ہو گئی اردو سے۔ آزادی کے موقع پر ہم لوگ ملتان شہر سے رخصت ہوئے اور دہلی کو اپنا وطن بنایا دہلی میں محمود ہاشمی سے ملاقات ہوئی اس کی شعر شناسی اور ذہانت نقد نے اپنا گرویدہ بنالیا۔ 1954 میں تعلیم مکمل کی اور تب سے برسر روزگار ہوں۔ 1962 سے 1964 تک 'تخلیق' کے حصہ نظم کا ایڈیٹر رہا۔ محمود ہاشمی کے ساتھ مل کر مختصر نظم کی ہیئت اور اہمیت پر کام کیا۔

(فن اور شخصیت: غزل نمبر مارچ 1978 ص: 541)

بانی کے انتقال پر ماہنامہ آج کل نے 'مشہور شاعر بانی کا انتقال' کے تحت ان کے بارے میں لکھا:

> ''اردو حلقوں میں یہ خبر افسوس کے ساتھ پڑھی جائے گی کہ اردو کے مشہور شاعر جناب بانی کا نئی دہلی میں 11 اکتوبر 1981 کو انتقال ہو گیا......
> جناب بانی کی ولادت 12 نومبر 1932 کو ملتان میں ہوئی۔ آزادی کے بعد ان کے والدین منتقل ہو کر دہلی آ گئے۔ یہیں بانی نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ یہیں ملازمت اختیار کر لی اور بالآخر اسی تاریخی شہر کی مٹی کا حصہ ہو گئے... شاعری کا شوق اوائل جوانی میں پیدا ہوا۔ غزل ان کی محبوب صنف سخن تھی۔ کلام کے دو مجموعے حرف معتبر 1971 اور حساب رنگ 1976 میں شائع ہوئے ان دونوں مجموعوں کو اتر پردیش اردو اکادمی نے انعام سے نوازا۔ بانی صاحب کو بہار اردو اکادمی نے بھی ان کی مجموعی

ادبی خدمات کے پیش نظر انعام سے نوازا۔ بانی نے ابتداً دیپک تخلص اختیار کیا۔ ان کا ابتدائی کلام راجیندر ردیپک کے نام سے ہندو پاک کے مشہور ادبی رسائل میں شائع ہوا۔"

(ماہنامہ آج کل دسمبر 1981، ص:3)

بانی کے انتقال پر شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا:

"بانی کا نام لیتا ہوں تو اس کا ہنس مکھ چہرہ، روشن آنکھیں، ودہست داری کا لہجہ، دل نوازی کی باتیں یہ سب آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہیں۔ لیکن پھر فوراً ہی اس کا کمزور جسم، اترا ہوا چہرہ، پیلا رنگ اور تکلیف سے ٹوٹا ہوا بدن بھی دل میں آنسوؤں کی طرح اترنے لگتے ہیں۔ جب میں نے آخری بار اس کو اسپتال کے پلنگ پر بے حال پڑا ہوا دیکھا تو بانی کا جسم موت کی آغوش میں تھا۔ شگفتگی کی جگہ پژمردگی تھی اور باہمت جواں مردی کی جگہ مایوسی اور اضمحلال کی زرد روشنی اس کی آنکھوں میں تھی۔ وہ بانی جو آٹھ سال سے انتہائی تکلیف دہ امراض اور اتنے تکلیف دہ علاج کی صعوبتیں ہنس ہنس کر اٹھاتا رہا تھا اب سپر انداختنی تھا۔"

(شب خون، اکتوبر تا دسمبر 1981، ص:3)

مذکورہ بالا اقتباسات سے کسی قدر بانی کی سوانح اور ان کے آخری ایام کی صعوبتوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے 'بانی— لو آدمیوں کا آدمی' کے عنوان سے بانی کا دلچسپ خاکہ لکھا، جو ان کی کتاب 'آدمی نامہ' میں شامل ہے۔ اس خاکے میں مجتبیٰ حسین نے بانی کے آخری ایام کا ذکر اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے:

"بانی ان دنوں چھوٹی بحر کا مصرعہ بن گئے تھے۔ ہاتھ میں ایک چھڑی بھی آگئی تھی، جو اس مصرعے کو وزن سے گرنے نہیں دیتی تھی۔ چھڑی کیا تھی اچھی خاصی ضرورت شعری تھی۔ اس وقت بانی کے حساب رنگ میں ایک ہی رنگ جڑا ہوا تھا اور وہ تھا زرد رنگ۔ یوں لگتا تھا

جیسے بانی بانی نہیں ہلدی کی گانٹھ ہیں۔"

(آدمی نامہ، مجتبیٰ حسین، ص:171)

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بانی کا خاکہ اس طرح کھینچا ہے:

"چوڑا ناک نقشہ، کھلتا ہوا رنگ، گٹھا ہوا کسرتی بدن، آج سے چند برس پہلے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا باصحت تنومند نوجوان دیکھتے ہی دیکھتے گھل گھل کر اپنی اصل کا نقشِ موہوم بھی نہیں رہ جائے گا۔"

(شفق شجر، ص:5)

ناقدینِ فن نے بالعموم بانی کی زندگی اور شخصیت کے بجائے ان کی شاعری کو اپنی تحریروں کا خاص موضوع بنایا ہے۔ لہٰذا اکادکا تحریریں ہی بانی کے سوانحی کوائف کی طرف رہنمائی کرتی ہیں وہ بھی انتہائی تشنہ ہیں، جن میں پیدائش وموت اور آخری ایام کی بیماری کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ طویل بیماری نے بانی کو بہت زیادہ مضمحل کر دیا تھا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی تحریر سے اس کا خاطر خواہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن یہ سچ ہے کہ بانی نے اپنی قوت ارادی سے جدید غزل کے نئے نئے مراحل سر کیے۔ جولائی 1981 میں بانی کی آخری غزل ماہنامہ 'آج کل' میں شائع ہوئی، اسی شمارے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بانی نے ایک سو سے زائد گیت بھی تخلیق کیے جن کا کچھ سراغ نہیں ملتا۔ اب تک وہ غیر مطبوعہ ہیں۔ من موہن تلخ نے اپنے مضمون 'بانی' میں لکھا ہے کہ 1958 تک بانی بانی نہ تھا بلکہ راجیندر ردیپک تھا۔ تلخ صاحب نے اسی مضمون میں مزید لکھا ہے کہ:

"بانی کی ادبی زندگی کی شروعات میری آنکھوں کے سامنے، میرے ہی قریب ہوئی تھی۔ بلکہ آج بانی کے ان گنت مداحوں کو یہ بھی بتادوں کہ 1958 میں جب میرا پہلا مجموعہ کلام 'چراغ فکر' شائع ہوا تب تک بانی بانی نہ تھا۔ بلکہ راجیندر ردیپک تھا، میں نہیں کہہ سکتا کہ بانی نے راجیندر ردیپک کی ان غزلوں کا کیا کیا۔ انھیں حرف معتبر میں شامل کیوں نہ کیا۔

آیئے اس کے اس دور کا ایک شعر سنئے:

مری ہستی کا سناٹا بڑی مشکل سے ٹوٹا ہے

تری آواز سن کر دیر تک حیراں رہا ہوں میں

یہ شعر اور اسی انداز کی دوسری غزلیں نہ حرف معتبر میں ہیں اور نہ حساب رنگ میں۔ ان غزلوں کو اپنے دونوں مجموعوں میں شامل نہ کرنے کا فیصلہ شاید بانی کا اپنا ہی رہا ہوگا۔''

(آج کل دسمبر 1981)

بانی کی ادبی زندگی کا آغاز من موہن تلخ کے سامنے ضرور ہوا لیکن جو غزلیں بانی کے مجموعے میں شامل نہیں ہیں ان کے بارے میں لاعلمی کے اظہار سے معلوم ہوتا ہے کہ تلخ صاحب نے بانی کی شاعری کو پڑھا ضرور ہے مگر 'حرف معتبر' کا مطالعہ انھوں نے غور سے نہیں کیا۔ اس مجموعہ کے شروع میں ہی 'کچھ انتخاب سے متعلق' جو تحریر ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کلام 1971 (حرف معتبر کا سال اشاعت) تک کا انتخاب ہے۔

چندر پرکاش شاد نے لکھا ہے کہ:

''جب بانی نے کہا کہ مجموعہ چھاپ رہا ہوں، میرے کلام کا انتخاب کردو... کہنے لگا بہت کڑا انتخاب کرنا ہے اور یہ کام تمھارے ذمے ہے۔ چنانچہ دو چار نشستیں ہوئیں۔ جہاں کہیں میں نے کوئی تجویز پیش کی بانی نے بڑی فراخ دلی سے قبول کی۔''

(حرف معتبر، ص:10)

ان سطور سے اندازہ ہوتا ہے کہ اشاعت کلام کے سلسلے میں بانی کا رویہ کتنا سخت تھا۔ اپنے کہے ہوئے شعر کو انتخاب کے ایک سخت مرحلے سے گزارنا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ بانی نے بہت زیادہ شاعری کی اور انتخاب کے بعد بہت سا کلام شائع ہونے سے رہ گیا۔ بانی کے اس رویے کو پیروی غالب سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ جو کچھ کہا جائے ضروری

نہیں کہ اس کو مجموعہ کلام میں شامل بھی کیا جائے۔ بہرحال یہ ایک مستحسن قدم ہے۔ ایسی صورت میں قاری کے سامنے جو بھی کلام پہنچتا ہے وہ عموماً بہتر ہوتا ہے۔

بانی کی غزل گوئی

جدید شعرا کی نئی نسل جو چھٹی دہائی میں نمایاں ہو کر سامنے آئی اس کی نمائندگی کرنے والے غزل گویوں میں بانی کا مقام خاصا بلند کہا جاسکتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بانی ایک طرف تو اس غزل کی نمائندگی کر رہے تھے جو اپنی پیش رو غزل بالخصوص ترقی پسند غزل سے یکسر مختلف تھی، دوسرے بانی نے اپنی غزل گوئی میں جو انداز اختیار کیا وہ ان کے ہم عصر دیگر جدید غزل گویوں میں بھی اپنی الگ شناخت قائم کر رہا تھا چنانچہ 1971 میں 'حرف معتبر' کی اشاعت کے بعد ہی بانی کی شاعری ناقدین شعر کی توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔ اس سے قبل ان کی شاعری کا اصل جوہر یا تو لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہا یا اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی۔ 'حرف معتبر' میں عمیق حنفی نے لکھا ہے:

> ''بانی کو اس صدی کی چھٹی دہائی کے بہترین اور اہم ترین غزل گویوں میں شمار کرنے سے مجھے کوئی مصلحت، کوئی تکلف اور کوئی خوف باز نہیں رکھ سکتا۔''

(حرف معتبر، ص:10)

عمیق حنفی نے یہاں بانی کو چھٹی دہائی کا اہم ترین غزل گو کہا ہے مگر 1967 میں ماہ نامہ 'کتاب' (لکھنؤ) کے سالنامے، 'جدید شاعری ایک سمپوزیم' میں عمیق حنفی کا ایک طویل مضمون ہے جس میں نئے شاعروں کی ایک طویل فہرست شامل ہے۔ عمیق حنفی کے بقول ان شعرا کی تخلیقات کا

مطالعہ نئی شاعری کی خوبیوں اور خامیوں کا اندازہ لگانے میں قارئین اور ناقدین کی مدد کر سکتا ہے مگر اٹھاون شاعروں کی فہرست میں بانی کا نام نہیں ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون بھی اس شمارے میں شامل ہے مگر وہاں بھی بانی کا نام نہیں ہے۔

1968 میں 'فنون' (لاہور، پاکستان) نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ایک انٹرویو شائع کیا تھا۔ اس میں جدیدیت کے نمائندہ شاعروں کی جو فہرست انھوں نے پیش کی، بانی کو وہاں بھی جگہ نہیں مل سکی۔

واضح رہے کہ مندرجہ بالا سطور کا مقصد ارباب دانش پر بانی کے تئیں بے اعتنائی برتنے کا الزام لگانا نہیں ہے۔ جدیدیت ایک رجحان ہے۔ ترقی پسند تحریک کے دوران جگہ جگہ جلسے جلوس کی بدولت ادیب و شاعر ایک دوسرے سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ ان کا یہ بھی رویہ تھا کہ تحریک کے شعرا کی پذیرائی کی جائے جبکہ 'جدیدیت' کے زمانے میں ایسا نہیں تھا۔ ہمارے عہد میں بھی اردو کا ایک بڑا حلقہ بانی کے نام اور کلام دونوں سے ناآشنا ہے۔ ممکن ہے اس میں بانی کے اس مزاجی رویے کا بھی کچھ دخل ہو جس میں وقتی شہرت طلبی کا دور دور تک گزر نہ تھا۔ ملحوظ رہے کہ بانی اس ہنگامے کے عینی شاہد رہے ہیں جو اچھے اچھوں کو بہا لے گیا لیکن اس کے باوجود بانی نے شہرت کے بجائے گمنامی پسند کیا۔ بانی کی پیچیدہ اور تہہ دار شاعری میں کہیں کہیں اس صورت حال کے کچھ دھندلے عکس بھی دکھائی دیتے ہیں۔ بانی کا مشہور شعر ہے ؂

اسے صف ابر رواں تیرے بعد
اک گھنا سایہ شجر سے نکلا

یہ شعر بانی کے فنی طرز اظہار کا خوب صورت نمونہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا کہ انھیں اپنے اوپر بہت اعتماد ہے بلکہ یہ بھی کہ وقتی اور عارضی دھند چھٹ جائے گی۔ صفِ ابر رواں لمحاتی عمل ہے حالانکہ دیکھنے والا دھوکے سے اسے دائمی سمجھ لیتا ہے۔ یہی یہی معاملہ شہرت کا بھی ہے۔ اسی غزل کا یہ بھی شعر ہے ؂

لمحے آدابِ تسلسل سے چھٹے
میں کہ امکانِ سحر سے نکلا

بانی کی شاعری کا مطالعہ شہرت کی عام ادبی فضا سے نہیں کرنا چاہیے۔ تاہم اس حوالے سے دیکھا ضرور جاسکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ بانی کے کلام کو وہ شہرت اور مقبولیت نہ مل سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ لیکن اگر اس کے اسباب پر نظر ڈالی جائے تو اس کی ایک فوری وجہ ان کی ناگہانی موت بھی ہوسکتی ہے۔ انھیں بہت کم مہلت عمر ملی۔ 'حساب رنگ' کی اشاعت کے بعد تو بانی کی عمر کا زیادہ تر حصہ بیماری میں گزرا۔

بانی نے جو شعری اسلوب اختیار کیا وہ آسانی سے گرفت میں نہیں آتا۔ اس کے لیے کوشش اور ریاضت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ترقی پسند نظریۂ شعر نے جس خطابی اور عوامی لہجے کی بنیاد ڈالی تھی اس کے زیر اثر عام طور پر لوگ سہل پسند اور براہ راست اسلوب کے عادی ہو گئے تھے۔ ایسے میں علامتوں، استعاروں اور شعری پیکروں کے امتزاج سے تخلیق شدہ شاعری سے صرف نظر کیا گیا۔ اس پہلو کا اطلاق زیب غوری کی شاعری پر بھی ہوتا ہے، جن کا اسلوب عموماً تجریدیت اور پیچیدگی سے عبارت ہے۔ ہمارے ادب فہموں نے بانی اور زیب غوری کے ساتھ تقریباً یکساں سلوک کیا۔ شہرت اور خود کو منوانے کے لیے نئے نئے طریقے ایجاد کرنے پڑتے ہیں۔ آسان طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی قافلے کے ساتھ ہولیا جائے۔ عام رویے سے ہٹ کر چلنے والوں پر توجہ کم ہی دی جاتی ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ بانی کے ساتھ بھی ہوا۔ تاہم ایک وقتی دھند کی کیفیت تھی۔ تصویر اور اس کا نظارہ کرنے والے میں ایک جمالیاتی بعد لازمی ہے۔ اب جبکہ بانی کو گزرے ہوئے تین دہائی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے یہ دھند اب ایک حد تک چھٹتی جارہی ہے۔

بانی کی ندرت فکر و اظہار کی بہت سی جہتیں ہیں اور تخلیقی عمل کی زرخیزی کا یہ سلسلہ 'حرف معتبر' سے 'شفق شجر' تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کے ہاں ترکیب سازی کا عمل بنیادی طور پر شاعر کی قوت ایجاد کا پتہ دیتا ہے۔ ترکیب سازی کا عمل تجربوں کی ترسیل کا بھی عمل ہے۔ یہ فن اور فن کار دونوں کے زندہ رہنے کا اشاریہ بھی ہے۔ اردو شاعری میں شعری مرکبات کا سب سے زیادہ عمل غالب کے یہاں ملتا ہے اور جدید شاعری میں بانی کے یہاں۔ زبان کو جس طرح بانی نے برتا اور شعری اظہار کے لیے جو لسانی تجربے کیے اس سے زبان پر ان کی حاکمانہ قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بانی کے شعری سفر میں جو نئے نئے مراحل آئے ہیں ان کا رشتہ نئے جہانِ معنی سے یہی ترکیبیں جوڑتی ہیں۔

جدید شاعری کے بنیادگزاروں میں بانی نے جس فنی اور خوش سلیقگی کا مظاہرہ کیا اس کی مثالیں بہت کم ہیں۔ شعر وادب میں تجربہ ایک مثبت عمل ہے مگر تجربہ صرف تجربہ بن کر رہ جائے تو اسے تخلیقی مرتبہ حاصل نہیں ہو پاتا۔ بانی کے بہت سے معاصرین نے تجربے کو بہت زیادہ اہمیت دی۔ لیکن بانی نے تخلیقی عمل کو اپنی محنت، ریاضت اور سلیقے سے واقعتاً تخلیقی عمل بنا دیا۔ شعری مرکبات بھی اسی عمل کا حصہ ہیں۔

لمحہ بخالی، عکس لاتفسیر، صد حساب آرزو، لمحہ بخندہ حواس، نشاط زیاں، بوسئہ بے ساختہ، شمع شکایت، لمحۂ کم مہرباں، لمحۂ بے وقت، بے گانۂ نفع وضرر، موج امکانی، وصال لمحہ لمحہ، صد برگ منظر، سرمایۂ ارزاں، سیّال بادیں، بیدار پانی، لمحہ رائیگاں، طلسم خانۂ رنگ، احساس رائیگاں، شفق شجر، سرد سناٹا، سبز سکوں، گھنا سرشار حاصل، خس ڈھیر منظر، سادہ نمائی اور کپاسی برف جیسی تراکیب، زبان اور اظہار بیان دونوں پر شاعر کی غیر معمولی دسترس کا پتہ دیتی ہیں۔

فنی ریاض کی دوسری جہت جو بانی کے کلام میں ملتی ہے وہ لفظوں کی تکرار ہے۔ جذبہ واحساس کو لفظ کے ذریعے ہی شعری تجربے سے گزارا جاتا ہے۔ شاعری کو اسی لیے لفظوں کا کھیل بھی کہا گیا ہے۔ معمولی فن کار خیال سے پہلے لفظ کے استعمال میں ٹھوکر کھاتا ہے۔ اکھڑی اکھڑی ترکیبیں اور مصرعے اس کی گواہی دیتے ہیں۔ لفظی تکرار کی کوشش تقریباً ہر فن کار کے یہاں ملے گی لیکن اسے فن کے بلند مرتبے پر لے جانا بہت دشوار کام ہے۔ اس طرح کی معمولی کوششوں سے جذبہ و خیال ہی نہیں بلکہ لفظ بھی اپنے استعمال پر حیرت زدہ ہوتا ہے حالانکہ لفظی تکرار سے ایک نئی شعری فضا خلق ہوتی ہے جو لفظی اور معنوی دونوں سطحوں پر اثر اور کیفیت میں اضافہ کرتی ہے۔ لفظی تکرار سے شعری حسن میں اضافہ ہی نہیں ہوا بلکہ اس سے معنوی فضا کو روشنی اور استحکام بھی حاصل ہوا ہے۔ گوپال متل نے لکھا ہے:

> ''انھوں نے [بانی] زبان و بیان کے بنیادی تقاضوں سے کہیں انحراف نہیں کیا ہے لیکن لفظوں کے برتنے کا انداز ان کا اپنا ہے۔ وہ بڑی ہنرمندی سے ایسی لفظی ترکیبیں وضع کرتے جاتے ہیں جو اچھوتی

معنویت کی حامل ہوتی ہیں اور قاری کے ذہن پر اپنی شگفتگی اور تازگی کا گہرا نقش چھوڑتی ہیں۔"

(حرفِ معتبر، ص:19)

لفظی تکرار کی صفت کے حامل چند اشعار درج ذیل ہیں ۔

اندر اندر یک بیک اٹھے گا طوفانِ نفی
سب نشاط نفع سب رنج ضرر لے جائے گا

گراں گراں نہ سزا کوئی سیر کرنے کی
سفر سفر نہ کوئی حادثہ گزرنے کا

آنکھ سے آنکھ نہ جوڑ کے دیکھو سوئے افق اے ہمسفر و
لاکھوں رنگ نظر آئیں گے تنہا تنہا دیکھو تم

اک بوند میرے خوں کی اڑی تھی طرف طرف
اب سارے خاکداں میں چمک بھی ہے باس بھی

پتہ پتہ بھرتے شجر پر ابر برستا دیکھو تم
منظر کی خوش تعمیری کو لمحہ لمحہ دیکھو تم

خلا خلا بازوؤں کو بھرتی نئی ہوائیں
سفر صدف بادباں سمندر نئے نئے سے

بانی شکن شکن سا تمہارا دروں بھی ہے
کچھ پارہ پارہ سا ہے تمہارا لباس بھی

فصیلِ شب سے عجب جھانکتے ہوئے چہرے
کرن کرن کے ہیں پیاسے ہوا ہوا کے ہیں

اب ہے بانی فضا فضا محروم
گونجتا ہے مکاں مکاں خالی

یہ رات گزرے تو دیکھوں طرف طرف کیا ہے
ابھی تو میرے لیے سب کچھ آسمان میں ہے

اردو کی جدید شعری روایت میں بانی کے علاوہ یہ کمال ہنر اور کسی کو حاصل نہیں۔ لفظی تکرار کے چند ایک تجربے فنی ہنر مندی کے ثبوت کے لیے تو مل سکتے ہیں لیکن بانی کی طرح انھیں اپنے اسلوب کا حصہ بنانا عام شعری طریق کار نہیں ہے۔ بانی کے یہاں کی دیگر مثالیں بھی ملتی ہیں۔ اس رویے سے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ وہ اپنے تجربوں کے لیے بندھے ٹکے انداز میں شعر کہنے کے بجائے الفاظ کی سطح پر ایک نیا پیرایۂ اظہار خلق کرتے ہیں جو ان کی انفرادی تخلیقی ہنر مندی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ بقول پروفیسر شمیم حنفی:

> کسی بھی شاعر کے تجربات خواہ کتنے ہی وسیع اور رنگا رنگ کیوں نہ ہوں اگر الفاظ و اصوات کے جادوئی لمس سے محروم رہے تو فن کی سحر کاریوں سے بے خبر قاری کی حد شمار میں بھی آسکتے ہیں۔ چنانچہ وہ تمام شعرا جن کی سخن سازی محض تجربات کے تنوع کی غذا پر زندگی کرتی ہے نئے تجربوں کی دریافت کے ساتھ ساتھ کم مایہ ہوتے جاتے ہیں۔ زندگی میں اتنے بھید چھپے ہوئے ہیں اور حاضر سے غائب تک اس کے سلسلے اتنی دور تک پھیلے ہوئے ہیں کہ ان کے انکشاف کا سفر کہیں ختم ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ ایسی صورت میں تکمیل کی لذت صرف ان لوگوں کا حاصل ہو سکتی ہے جو زماں کے کسی مخصوص لمحے یا مکاں کے کسی مخصوص نقطے کو اپنے سفر کی حد کمال سمجھ کر مطمئن ہو بیٹھیں۔ چنانچہ اس معمے کا حل یا اس نارسی کی تسخیر کا راستہ ایک شاعر کے لیے اس کے سوا اور کیا رہ جاتا ہے کہ وہ لفظ اور آواز کی بے حساب اور سرکش توانائیوں پر قابو پانے کی کوشش کرے۔"
>
> (غزل کا نیا منظر نامہ، شمیم حنفی، ص:154)

لفظ اور آواز کی سرکش توانائیوں پر قابو پانے کی جس کوشش کی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا

گیا اس کا انطباق بانی کے کلام پر کچھ زیادہ ہی ہوسکتا ہے۔ بانی کو اس کا شعوری احساس اپنے شعری سفر کی ابتدا سے ہی تھا۔ انھوں نے 'حرف معتبر' میں کہا ہے ؎

یہی کہ خالی سے لفظوں کو معنی دیتے پھریں
ہمارے پاس ہے اس کے سوا ہنر بھی کیا

جبکہ شفق شجر میں کہا ؎

شاعری کیا ہے کہ اک عمر گنوائی ہم نے
چند الفاظ کو امکان و اثر دینے میں

خالی لفظوں کو معنی دینے یا الفاظ کو امکان و اثر سے مالا مال کرنے کا ہنر بانی کو خوب آتا ہے۔ اس ہنرمندی کا ثبوت بانی کی وضع کردہ ترکیبیں اور لفظی تکرار کے ساتھ ساتھ جذبہ و احساس کو متحرک کرنے والے وہ الفاظ بھی ہیں جو بانی کی شاعری میں پیکر کی شکل میں برتے گئے ہیں۔ پیکر دراصل حواس خمسہ کو متحرک کرتا ہے، جس سے شاعر اپنے تخلیقی تجربوں کو ایک نقش کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ یہی عمل شاعری میں گنجینۂ معنی کا طلسم بھی پیدا کرتا ہے۔ اس حوالے سے بھی جب بانی کے کلام کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو راز کھلتا ہے کہ برسوں سے مستعمل زبان اور الفاظ کو بانی نے ترکیب سازی، لفظی تکرار اور پیکر تراشی کے عمل سے گزار کر شاعری کی معنویت اور زبان کی قوت میں غیر معمولی اضافہ کیا ہے:

نہیں ہے آنکھ کے صحرا میں ایک بوند سراب
مگر یہ رنگ بدلتا ہوا سا کچھ تو ہے

اس طرح شب گئے ٹوٹی ہے امید
کوئی دیوار گری ہو جیسے

اپنے آنچل پر سجا لے میری کچھ سیال یادیں
میں سلگتا رنگ ہوں میری ضیا محفوظ کر لے

ان اشعار میں آنکھ کے صحرا میں ایک بوند سراب، شب گئے امید کا ٹوٹنا، اور آنچل پر سیال

یادیں سجانا بصری پیکر کے خوب صورت نمونے ہیں۔ 'حرف معتبر' سے 'شفق شجر' تک کے مطالعے کے دوران اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کے خالق کا تجربہ اکہرا نہیں ہے بلکہ اس کی شعری دنیا علائم اور پیکر تراشی کے خوب صورت امتزاج سے خلق ہوئی ہے، جس سے جذبہ واحساس بیدار ہی نہیں ہوتے بلکہ تحیر انگیز معنویت کے دروازے بھی قاری پر کھلتے ہیں۔ پیچیدگی اور معنوی تہہ داری کے لیے بانی کے یہاں مظاہر فطرت کی جلوہ نمائیاں بھی پیکر کی شکل میں موجود ہیں ؂

جھلستی خاک پہ تنہا پڑا ہے برگ امید
ہوا کا اس لٹے رستے سے اب گزر بھی کیا

ایک ٹہنی کا یہاں اپنا مقدر کیسا
پیڑ کا پیڑ ہی گرتا ہے جدا میں کیا ہوں

آنکھ میں اترا ہوا تھا شام کا پہلا ستارہ
رات خالی سر پہ تھی اور سرد بستر سامنے تھا

اپنے سینے میں کہیں میری وفا محفوظ کرلے
میں کہوں تیرا ہوں میں، میرا کہا محفوظ کرلے

اک گھنے سرشار حاصل کی فضا ہے اور دونوں
اب نہیں ہے درمیاں کوئی بھی منزل امتحانی

میں کہ تھا منکر ترا اور اب کہ میں قائل کھڑا ہوں
اے وصال لمحہ لمحہ اے عطائے آسمانی

اس رواں پانی سے اک رشتہ ہے میری دھڑکنوں کا
اس ندی کی ریشمی سی نم صدا محفوظ کرلے

اک دھواں ہلکا ہلکا سا پھیلا ہوا ہے افق تا افق
ہر گھڑی اک سماں ڈوبتی شام کا ہے افق تا افق

سیکڑوں وحشتیں چیختی پھر رہی ہیں کراں تا کراں
آسماں نیلی چادر سی تانے پڑا ہے افق تا افق

دیکھیے کیا کیا ستم موسم کی من مانی کے ہیں
کیسے کیسے خشک خطے منتظر پانی کے ہیں
افق سے تا بہ افق پھیلتی بکھرتی گھٹا
گئی رتوں کا چمکتا غبار لے آئی

ان اشعار میں جھلستی خاک، ٹہنی کا مقدر، شام کا پہلا ستارہ، گھنے سرشار حاصل کی فضا، رواں پانی سے دھڑکنوں کا رشتہ، ہر گھڑی ڈوبتی شام کا سماں، آسمان کا نیلی چادر تانے پڑے رہنا، موسم کی من مانی کے ستم اور گئی رتوں کا چمکتا غبار ہمیں ایک ایسی خارجی دنیا کی سیر کراتے ہیں جس کا مشاہدہ ہم روز کرتے ہیں لیکن اس تخلیقی اور حسیاتی سطح سے نہیں جیسا کہ ایک فن کار کرتا ہے۔ اشعار میں برتی گئی لفظیات سے ہمارا پہلا واسطہ فطرت کے ان خوب صورت مظاہر اور مناظر سے ہوتا ہے جو ہمارے ماحول کا حصہ ہیں۔ آخر کے پانچ اشعار میں خارجی مشاہدے اور تجربے کی جو صورت گری ہوئی ہے وہ بہت انوکھی اور لاجواب ہے۔ متضاد کیفیات نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ ایک طرف آسمان نیلی چادر تانے پڑا ہے تو دوسری طرف سیکڑوں وحشتیں چیختی پھر رہی ہیں۔ موسم کی من مانی کے ستم کی تصویر یہ ہے کہ خشک خطے پانی کے لیے سراپا منتظر ہیں۔ 'کیسے کیسے' سے ان خشک خطوں کی غیر معمولی خرابیِ حال کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بانی نے ہوا، رت، منظر، عکس، سایہ، دھند، شجر، عجب، پتہ، موسم، پر اور خلا جیسے الفاظ کا استعمال بہت زیادہ کیا ہے۔ نئی شاعری میں بھی یہ الفاظ بہت زیادہ مستعمل رہے ہیں مگر بانی نے انھیں استعارہ، علامت اور پیکر کی صورت عطا کر کے نئے شعری تجربے سے اس طرح ہم آہنگ کر دیا کہ مذکورہ بالا الفاظ بانی کی شعری کائنات کا اہم جز بن گئے۔ علامتوں اور پیکروں کے امتزاج سے خلق کیے گئے اشعار کی اساس بانی کے یہاں بالعموم استفہام و استعجاب پر ہے۔ معنویت سے بھرے ہوئے شعر کی یہ صورت سب سے زیادہ کامیاب اور موثر تسلیم کی گئی ہے۔ اکہرے اور سادہ تجربات پر مبنی اشعار بالعموم مشکل الفاظ کی عقدہ کشائی کے بعد وہ حسن نہیں رکھتے جو اس سے پہلے ہوتا ہے۔ 'حرف معتبر' میں بانی نے عجب، منظر اور عکس سے جو شعری فضا خلق کی ہے۔ ان پر بھی استعجاب اور حیرت کی فضا غالب ہے۔

دکھا کے لمحۂ خالی کا عکس لا تفسیر
یہ مجھ میں کون ہے مجھ سے فرار کرتے ہوئے

نہ منزلیں تھیں نہ کچھ دل میں تھا نہ سر میں تھا
عجب نظارۂ لا سمتیت نظر میں تھا

ٹوٹا عجب طرح سے طلسم سفر کہ جب
منظر ہمارے چار طرف ہولناک تھے

مجھے کیا خبر تھی تری آنکھ میں
عجب ایک عکس دگر ہے مرا

کوئی منظر ہے نہ عکس اب کوئی خاکہ ہے نہ خواب
سامنا آج یہ کس لمحۂ خالی کا ہے

وہی اک موسم سفاک تھا اندر بھی باہر بھی
عجب سازش لہو کی تھی عجب فتنہ ہوا کا تھا

لمحۂ خالی کا عکس لاتفسیر، نظارۂ لاسمتیت، ہولناک منظر، عجب ایک عکس دگر، کوئی منظر ہے نہ عکس اور عجب سازش جیسے کلیدی الفاظ متکلم کی بے اطمینانی اور بے چینی کا مظہر ہیں۔ ان اشعار کی ظاہری فضا ہمیں ایک ایسی دنیا سے متعارف کراتی ہے جہاں سکون اور آرام خواب کے سوا کچھ نہیں۔ اجنبیت اور ماحول سے بے اطمینانی متکلم کا مقدر ہے لیکن مایوسی اور محرومی نہیں۔

بانی کی شاعری میں وسعت، اڑان، سفر، افق، لہو، پرندہ جیسے الفاظ کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ دراصل بانی انھیں بطور علامت جس طرح کا شعری تجربہ بنا رہے ہیں اور جس ہنرمندی کا ثبوت دے رہے ہیں وہ ان کے معاصرین ہی کیا موجودہ دور شاعری میں بھی کم ہی برتا گیا ہے۔ ان اشعار کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بانی کو لفظوں کے استعمال اور انھیں برتنے کے لیے بہت ریاض کرنا پڑا ہوگا۔

ادھ کھلی کھڑکی سے ہم وسعتیں دیکھا کیے؟
گھر سے نکلتے نہ تھے چین بھی گھر میں نہ تھا

خاک وخوں کی وسعتوں سے باخبر کرتی ہوئی
اک نظر امکاں ہزار امکاں سفر کرتی ہوئی

کیا کھڑا ندی کنارے دیکھتا ہے وسعتیں
کیا سمجھتا ہے کوئی موج سمندر آئے گی

تحرک اور تجسس کا جذبہ ہمیشہ امکانات کی دنیا کی سیر کراتا ہے۔ بانی اسی جذبے کے تحت کھلی فضا میں سانس لینے کے متمنی ہیں۔ اوپر کے شعر میں وسعت کو کھڑکی، خاک وخوں اور موج سمندر سے قریب تر کر کے معنی آفرینی کی بھر پور کوشش کی گئی ہے۔

'اڑان' اپنے لغوی معنی کے علاوہ بھی بہت سے معانی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کھلے آسمانوں کی سیر کے علاوہ لفظ 'اڑان' زمین اور آسمان سے ربط و تعلق کا ایک وسیلہ بھی قائم کرتا ہے۔

طائر کو دے آزاد اڑانوں کی فضائیں
کہسار کو دریا کے اچھلنے کی خبر دے

پرندے پہلی اڑانوں کے بعد لوٹ آئے
لپک اٹھا کوئی احساس رائیگانی کا

فضا کہ بس آسمان بھر تھی
خوشی سفر کی اڑان بھر تھی

پھر ہوئی ہے ہمیں مٹیوں کی تلاش
ہم ہیں اڑتا سفر اب ڈھلانوں کا ہے

کیا کہوں کیا تھی اڑان خود میں خبر میں نہ تھا
گمشدگی کے سوا کچھ بھی سفر میں نہ تھا

اس کی نظروں میں سارے مقامات ہیں
پر اسے شوق اندھی اڑانوں کا ہے

ان اشعار کا احساس یا سفر کی خوشی بس اڑان بھر تھی دراصل اس بات کا اشارہ ہے کہ خوشی کا لمحہ بہت مختصر ہے۔ پانچویں شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اڑان گمشدگی کے سفر کے سوا کچھ نہیں یعنی ہم ایک ایسی کوشش میں مصروف ہیں جس کا حاصل کچھ نہیں بس کوشش کی حد تک خوشی کا احساس رہتا ہے لیکن بانی کے ان اشعار سے متحرک رہنے کے جذبے کا جواز ضرور فراہم ہوتا ہے۔ چوتھا اور چھٹا شعر اس حقیقت سے متعارف کراتا ہے کہ انسان خوشی کے لمحات کو عارضی جاننے کے باوجود اس لمحہ کا متلاشی رہتا ہے لیکن اندھی اڑانوں کا خاتمہ ان مٹیوں سے عبارت ہے جہاں وہ رہتا اور بستا ہے یعنی حقیقی دنیا ہی اس کی اساس اور بنیاد ہے۔ خوشی کی عارضی مدت کے بعد بالآخر انسان کو اپنی اسی دنیا میں واپس آنا ہے جسے بانی نے حقیقت سے تعبیر کیا ہے۔ گھٹن بھرے ماحول سے نکلنے کی کوشش انسان کا بنیادی اور مثبت جذبہ ہے۔ یہی جذبہ اسے متحرک اور ہمہ وقت مصروف رکھتا ہے اور نت نئے جہانوں کی سیر بھی کراتا ہے لیکن یہاں متکلم کامیابی یا ناکامی سے پرے سرگرم عمل رہنے کے جذبے سے سرشار ہے، فراریت سے نہیں۔

سفر کی علامت/ استعارہ بانی کے یہاں سفر کی مختلف کیفیات اور جہات کا بھرپور احاطہ ہی نہیں کرتا بلکہ اس لفظ کی پوری داستان بھی بیان کرتا ہے ۔

اسے معلوم تھا اک موج مرے سر میں ہے
وہ جھجکتا تھا مجھے حکم سفر دینے میں

سفر کا ایک ایسا تصور جو اسے امکانات کی دنیا کی سیر کرا سکتا تھا مگر متکلم کا اندرونی اضطراب مانع ہے۔

ذرا سی بے خبری کا گزر نہ تھا اس میں
سفر کے ساتھ عجب سلسلہ تھا ارماں کا

ٹوٹا عجب طرح سے طلسم سفر کہ جب
منظر ہمارے چار طرف ہولناک تھے

وہ کوتاہی ذرا سی
سفر دشوار اس کا

یہاں سفر حساس ذہن سے عبارت ہے۔ ذرا سی بے خبری یا کوتاہی سفر کرنے والے کے لیے دشوار گزار ہو سکتی ہے ۔

کیا کہوں کیا تھی اڑان خود میں خبر میں نہ تھا
گم شدگی کے سوا کچھ بھی سفر میں نہ تھا
زماں مکاں تھے مرے سامنے بکھرتے ہوئے
میں ڈھیر ہو گیا طولِ سفر سے ڈرتے ہوئے

ان اشعار کا متکلم ایک ایسی کوشش کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس کا حاصل کچھ نہیں جبکہ دوسرے شعر میں اپنی مجبوری اور بے بسی کا اعلان ہے کہ سفر اگر چہ طویل ہے لیکن اس سے مفر ممکن نہیں یعنی زندگی کے لیے سفر کو طے کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ زندگی کے متعین اصولوں اور راستوں سے کنارہ کشی کا نقشہ باقی نے یوں کھینچا ہے۔

عجب سفر تھا کہ ہم راستوں سے کٹتے گئے
پھر اس کے بعد ہمیں لاپتہ بھی ہونا تھا

سفر دشواریوں سے عبارت ہے۔ آسان اور سپاٹ سفر انسانی ذہن پر کوئی تاثر قائم نہیں رکھ سکتا ہے۔ پریشانیاں اور مصائب ہی اس کو آگے بڑھنے کا حوصلہ عطا کرتے ہیں۔

کوئی پہاڑ نہ دریا نہ آگ رستے میں
عجب سپاٹ سفر ہے کہ حادثہ چاہوں

یہاں سپاٹ سفر سے زندگی بھی مراد لی جا سکتی ہے۔ متکلم یہاں اس بے کیف زندگی کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس میں کوئی رنگ اور کیف نہیں ہے، کوئی تنوع اور ہما ہمی نہیں ہے۔

یہی سمجھ کے اسے خود صدا نہ دی میں نے
وہ تیز گام کسی دور کے سفر میں تھا
مجھ کو اس دلچسپ سفر کی راہ نہیں کھوئی کرنی
میں عجلت میں نہیں ہوں یارو اپنا رستہ دیکھو تم

یہاں طمانیت اور اطمینان کی وہ کیفیت ہے جو ہر حال میں سیرابی اور آسودگی عطا کرتی ہے۔ سفر کے نئے نئے پڑاؤ پر تیز روی اور جلد بازی کا مظاہرہ اس کا مسلک نہیں۔ مسافر سفر کی جملہ رعنائیوں اور جلوہ سامانیوں سے اپنے آپ کو پوری طرح سیراب کرنے کا خواہاں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کے ساتھ چلنے والا کوئی نہیں ہے بلکہ سفر کے دوران گاہے بہ گاہے از خود کسی مجبوری کے تحت لوگ آجاتے ہیں۔ جیسا کہ اگلے شعر میں اشارہ ہے۔

یوں اکیلے کا سفر تھا بانی
میں بھی خود اپنے برابر میں نہ تھا

منزل مقصود کا حصول مسافر کی معراج کمال ہے۔ جہاں پہنچ کر سفر کی ساری دشواریاں اس پر سہل ہوجاتی ہیں لیکن منزل پر پہنچنے کے بعد اگر یہ منظر تبدیل ہوجائے تو خوشی اور مسرت کے جذبات کے علی الرغم اسے ایک نئے سفر کا مژدہ بھی کہا جاسکتا ہے۔

یہ حسن ختم سفر یہ طلسم خانۂ رنگ
کہ آنکھ جھپکوں تو منظر نیا ہے میرے لیے

مذکورہ بالا شعر سفر در سفر کا خوب صورت معنوی استعارہ ہے۔ بانی کی شاعری میں سفر ایک ایسی کوشش سے عبارت ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ کامیابی یا ناکامی سے پرے امکان پر نگاہ رکھے ہوئے اپنے قاری کو نئے جہانوں کی سیر کراتا ہے۔ سفر کی مختلف جہات کو زندگی کے آئینے میں صاف دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے کیونکہ سفر بھی ایک زندگی ہے۔

فاصلہ کم کرنے والے راستے شاید نہ تھے
اب تو لگتا ہے سفر ہی درمیاں ایسا نہ تھا
لوگ منزل پہ تھے ہم سے پہلے
تھا کوئی راستہ شاید آسان

ان اشعار میں جہاں متکلم کا گمان یہ ہے کہ صحیح رہنمائی کرنے والے نہیں ہیں ورنہ یہ طویل فاصلے کم ہوسکتے تھے لیکن اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مزاج میں سہل پسندی نہیں ہے جبکہ دوسرے

شعر میں متکلم یہ کہہ رہا ہے کہ ایک آسان راستہ تھا جس کی وجہ سے لوگ ہم سے پہلے منزل تک آ گئے۔ ہر چند کہ یہ اشعار دو مختلف طرح کے ہیں لیکن 'طویل سفر' اور 'آسان راستہ' دونوں جگہوں پر کسی طرح کا تاسف یا تعجب نہیں ہے بلکہ 'شاید' سے شعری فضا اور اپنے اظہار کی تکمیل کی گئی ہے۔
سفر کی علامت سے خلق کیے گئے اس بے مثال شعر کے بغیر بات مکمل نہیں ہو سکتی ۔

راستہ ختم جہاں ہوتا ہے
اک سفر اور ادھر رکھ دینا

مٹھی بھر سادہ سے لفظوں میں جد و جہد کی ایسی ترغیب دی گئی ہے جس میں نہ نظریہ ہے اور نہ فلسفہ۔ نہ سفر کی دشواریوں کا ذکر ہے نہ صعوبتوں کا بیان۔ یہ شعر غالب کے مشہور زمانہ شعر کی بھی یاد دلاتا ہے ۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقش پا پایا

اسے بانی کا کمال ہنر ہی سمجھا جائے گا کہ ان کے اشعار کلاسیکی شعرا کی یاد تازہ کر دیں اور یہی نہیں بلکہ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہمارے کلاسیکی شعرا کے یہاں جو مضامین پہلے ہی حد درجہ بلندی حاصل کر چکے تھے ان کو جب ہمارے زمانے کے جدید شعرا برتتے ہیں تو ان میں معنی و مفہوم کے کچھ نئے پہلو ضرور پیدا کر دیتے ہیں جیسا کہ اوپر بانی کے اس شعر میں آپ نے دیکھا۔ غالب کا مضمون بانی کے یہاں بالکل نئے انداز میں ہمارے سامنے آتا ہے۔
سفر کی اس رنگارنگی میں دشواریوں اور صعوبتوں کے باوجود نہ سفر سے واپسی کی کوئی بات ہے اور نہ اس سے پریشان ہو کر زندگی سے بیزاری۔ سفر کے کٹھن راستوں کی طرح بانی نے اپنے اظہار کے لیے بھی وہ راستہ منتخب کیا جو سہل پسندوں کے لیے آسان نہ تھا۔
افق کی معنوی جہت ملاحظہ کریں ۔

کس مسلسل افق کے مقابل ہیں ہم
کیا عجب سلسلہ امتحانوں کا ہے

کہاں تلاش کروں اب افق کہانی کا
نظر کے سامنے منظر ہے بے کرانی کا

افق کے مسافر کی منزل دور سے دور تر ہوتی جاتی ہے۔ گویا ایک بے منزل سفر کا راہی، جس طرح ہم افق کے سامنے ہوتے ہوئے بھی اس کو کبھی نہیں پاسکتے اسی طرح ہماری آزمائش کا سلسلہ بھی دراز سے دراز تر ہوتا جارہا ہے اس کا بھی انجام نہیں۔ دوسرا شعر انسانی زندگی کی بے بسی کا اعلان نامہ ہے کہ ہمارا وجود افق کی لامحدود وسعتوں میں بکھر کر رہ گیا ہے۔

جانے کس کا کیا چھپا ہے اس دھوئیں کی صف کے پار
ایک لمحے کا افق امید بھر میرا بھی ہے

دھوئیں کی صف کے پار جو کچھ پوشیدہ ہے اس کا حصول ہی پریشاں حالی کا علاج ہے۔ سکون کا لمحہ پریشانی کے بعد ہی میسر ہوگا۔ ایک لمحہ کا افق اسی پریشاں حالی کو دور کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔

روتے روتے کوئی تھک کے چپ ہوگیا دو گھڑی کے لیے
ایک نمناک سناٹا اب چیختا ہے افق تا افق

افق سے تا بہ افق پھیلتی بکھرتی گھٹا
گئی رتوں کا چمکتا غبار لے آئی

لفظ 'لہو' کی نیرنگیاں دیکھیے۔

ترے لہو میں بیداری سی کیا شے ہے
لس ذرا سا اور مہکنے والا میں

وہی ملاقات رو بہ رو کی
دھواں بدن کا مہک لہو کی

وہی اک موسم سفاک تھا اندر بھی باہر بھی
عجب سازش لہو کی تھی عجب فتنہ ہوا کا تھا

مری صدا نہ سہی ہاں مرا لہو نہ سہی
یہ موج موج اچھلتا ہوا سا کچھ تو ہے
لرزاں ہے کب سے لہو کے افق پر
زہراب میں تر بہ تر ایک لمحہ
رقص یک قطرہ خوں آپ کشش آپ جنوں
اے کہ صد تشنگیِ حرف و صدا میں کیا ہوں
اک بوند میرے خوں کی اڑی تھی طرف طرف
اب سارے خاکداں میں چمک بھی ہے باس بھی

لہو کی حرارت زندگی کا استعارہ ہے، زندگی کی ساری توانائیاں اور نیرنگیاں اسی کے دم سے قائم ہیں۔انسانی جسم کی دلکشی اور حسن کی تابنا کی ہی نہیں ذہن وفکر اور عقل وخرد کی جولانیاں بھی اسی کی رہین منت ہیں۔دنیا میں برپا ہونے والے سارے انقلاب اسی پر منحصر ہیں خواہ وہ فرد کی زندگی میں آئیں یا سماج اور ملک کی زندگی میں۔لہو کے اندر فنا اور بقا دونوں کا سامان موجود ہے۔انسانی جذبات وخیالات پر لہو کی بالادستی ہی زندگی کے نشیب وفراز کی بنیاد ہے۔عشق کے جنوں اور حسن کی کشش کا سارا سامان بھی فراہم کرتا ہے۔یہ لہو ہی ہے جو وجود کے لیے انعام تو کبھی آزار بن جاتا ہے۔ابتدائی دو شعر جس سطح پر اس رومانی فضا سے متعارف کراتے ہیں جو زندہ اور گرم لہو سے عبارت ہے۔تیسرے شعر میں لہولہان واردات کی طرف اشارہ ہے۔لہو کی فراوانی زندگی کے لیے جب آزار کا سبب بن جاتی ہے یعنی زندگی کو توانائی اور قوت دینے والا لہو ہی زندگی کے لیے فتنہ بن جائے۔چوتھا شعر لہو کی حرکت پذیری کی گواہی دے رہا ہے۔پانچویں شعر میں متکلم لہو کے سبب ہی موت سے قریب تر ہے۔پہلے مصرعے میں 'کب سے' اور دوسرے مصرعے کی ردیف 'لمحہ' متضاد کیفیات کو نمایاں کرتے ہیں۔پیکریت اور استعجابیہ انداز سے جو بانی کے شعری اظہار کا مخصوص طریقہ ہے، خاص فضا خلق کر کے شعر کے حسن کو شاعر نے دوبالا کر دیا ہے۔چھٹا شعر جس تجربے کا اظہار کر رہا ہے وہ بیک وقت پیچیدہ اور تہہ دار ہے اور کئی سطحوں پر ہمیں متوجہ کرتا ہے۔ لہو کے قطرے کو رقص کرتا ہوا کہہ کر شاعر نے اس سے کشش اور جنوں کی کیفیت کا ایک

طرح سے جواز فراہم کردیا ہے۔ یہاں لہو رقص کا منظر حزنیہ اور طربیہ دونوں کیفیات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ دوسرے مصرعے میں جس ہستی سے خطاب کیا گیا ہے وہ حرف وصدا کی پیاسی ہے یعنی بے زبان ہے۔ اس صورت حال میں متکلم خود اپنے وجود کے بارے میں کوئی واضح رائے قائم کرنے سے قاصر ہے دوسرے لفظوں میں وہ خود اپنے بارے میں جاننا چاہتا ہے کہ وہ درحقیقت کیا ہے۔ اس شعر میں قطرہ خوں کے رقص اور صد تشنگی حرف وصدا جیسے پیکر استعمال کر کے بانی نے شعر میں ایسی فضا خلق کی ہے جس کی تہہ سے بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں اور اس طرح معنی کے امکانات بھی بہت وسیع ہو جاتے ہیں۔

پرندے کو علامت کے طور پر شعری قالب عطا کر کے بانی نے معنوی پرواز کے نئے آسمانوں کی دریافت کی ہے۔ کھلی فضا میں سیر کرنے والے پرندے کی طرح بانی بھی اپنے شعری مسلک میں آزادی اور اس کے ہمہ جہت اظہار کے خواہاں ہیں۔

اڑ چلا وہ اک جدا خاکہ لیے سر میں اکیلا
صبح کا پہلا پرندہ آسماں بھر میں اکیلا

ادیبوں اور شاعروں کے ہجوم میں جدا خاکہ بانی بھی چاہتے ہیں۔ زمانے اور ماحول سے نارسائی کا پس پردہ گلہ بھی ہے شاید اسی لیے وہ مسلسل حرکت میں ہیں۔

ڈھانپ دیا سارا آکاش پرندے نے
کیا دل کش منظر تھا پر پھیلانے کا

نہ جانے کل ہوں کہاں ساتھ اب ہوا کے ہیں
کہ ہم پرندے مقامات گمشدہ کے ہیں
طائر کو دے آزاد اڑانوں کی فضائیں
کہسار کو دریا کے اچھلنے کی خبر دے
مست اڑتے پرندوں کو آواز مت دو کہ ڈر جائیں گے
آن کی آن میں سارے اوراق منظر بکھر جائیں گے

اے پیہم پرواز پرندے دم لے لے
نہیں اترتا آنگن میں تو چھت پر آ
افق کو جاتے ہوئے پرندے
فضا کہ پرواز بھر کشادہ
نمک نشیلی گداز فصلیں نئی نئی سی
افق پرندے گلاب بستر نئے نئے سے
میں یہ سمجھا تھا کہ سرگرم سفر ہے کوئی طائر
جب رکی آندھی تو اک گرتا ہوا پر سامنے تھا*

(شمس الرحمٰن فاروقی نے دوسرے مصرعے کو اس طرح لکھا ہے۔''جب رکی آندھی تو اک ٹوٹا پر سامنے تھا۔'' شب خون اکتوبر تا دسمبر 1981 ص:3)

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بانی کی شاعری میں طائر کو آشوب زدہ آگہی سے گریز و انحراف کی سب سے متحرک علامت قرار دیا ہے۔ان کے بقول:

> پرندے کی علامت بانی کا شاعری میں زمین اور آسمان کے ربط و تعلق کو بھی ظاہر کرتی ہے کیونکہ پرواز کسی مقام سے شروع ہوتی ہے، فضا میں یہ کتنی ہی بلند ہو اختتام پذیر پھر کسی مقام پر ہوتی ہے۔ اب یہ بات واضح طور پر کہی جاسکتی ہے کہ بانی کی شاعری موجود سے لاموجود کی طرف، مکان سے لامکاں کی طرف اور واقعے سے امکان کی طرف مسلسل آمد و رفت کی شاعری ہے۔ یہاں آمد و رفت دونوں کی معنویت پر زور ہے۔ یہ گریز محض یا پرواز محض کی شاعری نہیں جو ذات یا حقیقت سے روگردانی کے مترادف ہے۔

(شفق شجر، ص:15تا16)

مندرجہ بالا آخری شعر بحر رمل مثمن سالم کے وزن (فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن) میں

ہے۔ یہ وزن اردو میں بہت کم مستعمل ہے۔ عام طور پر شعرا اس وزن میں آخری فاعلاتن کی جگہ فاعلن/ فاعلان (محذوف/مقصور) استعمال کرتے ہیں۔ غالب کی مشہور غزل ''نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا'' بحر رمل مثمن محذوف/مقصور میں ہے۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن/ فاعلان۔

متذکرہ بالا علامتوں کے ساتھ ساتھ خلا، ہوا، رات، سایہ، سحاب، دھند، دھواں، شجر، پتہ اور موسم وغیرہ جیسے الفاظ بھی تخلیقی جوہر کے سبب، استعارہ/ علامت/ پیکر کی شکل میں بانی کی شعری کائنات کا حصہ بن گئے ہیں۔ کلاسیکی شعرا کی بہ نسبت جدید غزل گویوں نے ان الفاظ کو زیادہ استعمال کیا ہے مگر بانی نے اپنے مخصوص شعری اظہار سے ان کی معنویت کو دو چند کر دیا۔ اس قبیل کے چند شعر ملاحظہ کیجیے۔

رنگ اب کوئی خلاؤں میں نہ تھا
کوئی پہچان نشانی میں نہ تھی

عجیب آب و ہوا کا وہ رہنے والا تھا
ملے گا خاک و خلا میں کہیں وطن اس کا

ہوائیں زور سے چلتی تھیں ہنگامہ بلا کا تھا
میں سناٹے کا پیکر منتظر تیری صدا کا تھا

اس تند سیاہی کے پگھلنے کی خبر دے
دے پہلی اذاں رات کے ڈھلنے کی خبر دے

میں کسی لحۂ بے وقت کا اک سایہ تھا
یا کسی حرف تہی اسم کا اظہار تھا میں

شعلہ ادھر ادھر کبھی سایا یہیں کہیں
ہوگا وہ برق جسم سبک پا یہیں کہیں

اے صف ابر رواں تیرے بعد
اک گھنا سایہ شجر سے نکلا

پاؤں تلے آنچ سی تشنہ زمینوں کی تھی
سر پہ نظارہ عجب اڑتے سحابوں کا تھا

یاد تری جیسے کہ سرشام
دھند اتر جائے پانی میں

شامل ہوں قافلے میں مگر سر میں دھند ہے
شاید ہے کوئی راہ جدا بھی مرے لیے

سرائے پر تھا دھواں جمع ساری بستی کا
کچھ اس طرح کہ کوئی سانحہ بھی ہونا تھا

لمبے کوس سفر تیرا
چھاؤں شجر شجر تیری

پتہ پتہ بھرتے شجر پر ابر برستا دیکھو تم
منظر کی خوش تعبیری کو لمحہ لمحہ دیکھو تم

زرد پتے کہ آگاہِ تقدیر تھے، ایک زائل تعلق کی تصویر تھے
شاخ سے سب کو ہونا تھا آخر جدا، ایسی اندھی ہوا کی ضرورت نہ تھی

سنگ نہیں ہوں بات نہ مانوں موسم کی
ہوا ذرا سی اور لچکنے والا میں

موسم کی بدلتی ہوئی اک موجِ ہوا تھی
مایوس میں بانی ابھی منظر سے نہیں تھا

ان علائم کے ذریعے انسانی وجود کے کرب کو ابھارا گیا ہے۔ شکست وریخت کا وہ دور جہاں انسان کی شناخت کیا اس کا وجود ہی خواب وخلا کا وطن بن چکا تھا۔ زمین سے آسمان تک ایک کرب ناک فضا تھی۔ ہوا وہوس کی آندھی نے امتیاز کے سارے نشانات مٹا ڈالے تھے لیکن کہیں نہ کہیں جا کر یہ احساس تو ضرور تھا کہ موسم اور آب وہوا کی یہ تبدیلی یاسفا کی عارضی ہے۔ صف ابرِرواں کو

ابدی تصور کرنے والوں کی بھیڑ میں بانی جیسا دیدہ ور بھی تھا جس کی نظر میں یہ ایک لمحاتی عمل کے سوا کچھ نہ تھا۔ بانی کے علائم و رموز کی ایک جہت سمندر، دریا اور ان کے متعلقات مثلاً موج بھنور، کشتی اور بادبان کی ہے۔

بانی نے زندگی کے وسیع تجربے کو نہ صرف برتا ہے بلکہ اپنی تجرباتی اور مشاہداتی دروں بینی کے سبب زندگی کے گہرے اور متنوع تجربات کو شعری زبان عطا کی ہے۔ اپنے ماحول سے بیزار شخص کو فطرت کے مناظر متاثر ہی نہیں کرتے بلکہ اس کا نظارہ اسے خوش بھی کرتا ہے۔ سمندر، موج، بادبان جیسے الفاظ کو زندگی کے تجربات سے ہم آہنگ کر کے انسانی زندگی کی نارسائیوں اور مسائل کی کشمکش میں گھرے لوگوں کی خوب صورت عکاسی کی گئی ہے۔ دریا کی وسعت انسانی زندگی کی بے کرانی کا بھی استعارہ ہے اور بھنور کو خواہشات کے ہجوم سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جس کو کسی کل چین نہیں ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے۔

سب چلے دور کے پانیوں کی طرف
کیا نظارہ کھلے آسمانوں کا ہے

آج اک لہر بھی پانی میں نہ تھی
کوئی تصویر روانی میں نہ تھی

جاؤ موجو میری منزل کا پتہ کیا پوچھتی ہو
اک جزیرہ دور افتادہ سمندر میں اکیلا

لہر تھی کیسی مجھے بھنور میں لے آئی
ندی کنارے ہاتھ بھگونے والا میں

اب کے ملنا تو مرے سینے میں
موج رکھ دینا بھنور رکھ دینا

شاعری کا ذکر حسن و عشق اور تصور جمال کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ حسن انسان میں ہو یا کائنات میں، شاعر کا جمالیاتی احساس اس کا ادراک ضرور کر لیتا ہے۔ بانی کا تصور حسن و جمال حواس کو متحرک اور بیدار ہی نہیں کرتا بلکہ لذت و کیفیت کا بھرپور شعور بھی دیتا ہے۔ حسن و عشق کے

انوکھے اور منفرد لمحات محبت کی جمالیات کا خوب صورت منظر نامہ بھی ہیں اور قاری کے لیے سیرابی اور آسودگی کا ذریعہ بھی۔ جنسی جذبہ محبت کے بے باک تجربوں کی نشاندہی کرتا ہے مگر جذباتیت سے احتراز کرتے ہوئے لفظ بدن سے ترتیب دیا گیا حسیاتی قوت کا منظر نامہ دیکھیے۔

مری نظر میں ہے محفوظ آج بھی بانی
بدن کسا ہوا ملبوس بے شکن اس کا
عجب تھا ذائقہ اس ایک لمس لرزاں کا
کھلا دیا ہے بدن میں گلاب امکاں کا
دمک رہا تھا بہت یوں تو پیرہن اس کا
ذرا سے لمس نے روشن کیا بدن اس کا
وہی ہوا کہ تکلف کا حسن بیچ میں تھا
بدن تھے قرب تہی لمس سے بکھرتے ہوئے
آدھے اَدھورے لمس نہ میرے ہاتھ پہ رکھ
کبھی سپرد بدن سا مجھے میسر آ
بدن بیدار اس کا
نشہ ہشیار اس کا
ترے بدن میں چنگاری سی کیا شے ہے
عکس ذرا سا اور چمکنے والا میں
بدن و حال آہنگ ہوا سا
قبا عجیب پریشانی میں

کسا ہوا بدن، بدن میں کھلا ہوا امکان کا گلاب، لمس سے بدن کا روشن ہونا، قرب تہی لمس سے بدن کا بکھرنا، سپرد بدن سا میسر آنا، بیدار بدن، بدن میں چنگاری اور بدن وحال آہنگ ہوا سا صرف بدن کی مختلف کیفیات کے آئینہ دار ہی نہیں بلکہ اپنے مخصوص شعری ڈکشن اور پیکریت کے ذریعے بانی نے بدن کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ ان اشعار کا خالق شعری پیکروں سے جنسی جذبہ کو

اس سطح تک لے جاتا ہے جہاں حسی قوتوں کا عمل دخل بہت تیز اور شدید ہوتا ہے۔
جو جنسی جذبے کو آسودگی بھی عطا کرتے ہیں۔ محبت کی تجسیم کا یہ انداز اور لفظ بدن کی یہ تخلیقیت بانی کی ہنرمندی کا غیر معمولی ثبوت فراہم کرتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بانی نے محبت کی تجسیم کا یہ ہنر براہ راست میر سے سیکھا ہے۔ جہاں معشوق ہماری ہی دنیا کا عام انسان ہے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

> بانی کو محبوب کا ایسا وجود قبول کرنے میں تامل تھا جو انسانی شخصیت نہ رکھتا ہو، محض رومانی یا محض جسمانی ہو، بانی کے یہاں جسم کے تذکرے میں ایک مہذب بے باکی ہے جو ہمارے زمانے میں کم شاعروں کے حصہ میں آئی ہے۔ بے باکی جذبے کی ہے اور تہذیب استعارے کی۔

(نئے انوکھے موڑ بدلنے والا، شفق شجر، ص:40)

جذبے کی بے باکی اور استعارے کی تہذیب کا یہ انداز بھی دیکھیے۔

جسم اور اک نیم پوشیدہ ہوس آمادگی
آنکھ اور میر لباسِ مختصر کرتی ہوئی

اوس سے پیاس کہاں بجھتی ہے
موسلادھار برس میری جان

آج رکھا ہے لحہ ترے ہاتھ پر لمس اول کی لذت کو محفوظ کر
کل نہ کہنا فلک خوش تعاون نہ تھا کل نہ کہنا زمیں خوبصورت نہ تھی

عجیب تجربہ تھا بھیڑ سے گزرنے کا
اسے بہانہ ملا مجھ سے بات کرنے کا

کوئی کھڑا ہے مری طرح بھیڑ میں تنہا
نظر بچائے مری سمت دیکھتا ہے بہت

لہجے کی انفرادیت اور اسلوب کی تازگی کا احساس بانی کو پڑھتے وقت بار بار ہوتا ہے۔ اس کا ادراک فنی اور موضوعاتی دونوں سطحوں پر ہے۔ گزشتہ صفحات میں بانی کی پیکریت،

علامت/ استعارے لفظی تکرار اور لفظی انسلاکات کی جو مثالیں پیش کی گئی ہیں وہ بانی کے اس رویے کو سمجھنے کے لیے بہت حد تک مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔

بانی کے کلام کا بڑا حصہ شعری پیکر، استعارے/ علامت پر مبنی ہے۔ البتہ 'حساب رنگ' کی دو غزلوں میں تشبیہ کا بھرپور استعمال ہم دیکھتے ہیں۔

لباس اس کا علامت کی طرح تھا
بدن روشن عبارت کی طرح تھا
فضا صیقل ساعت کی طرح تھی
سکوت اس کا امانت کی طرح تھا
ادا موج تجسس کی طرح تھی
نفس خوشبو کی شہرت کی طرح تھا
بساط رنگ تھی مٹھی میں اس کی
قدم اس کا بشارت کی طرح تھا
گریزاں آنکھ دعوت کی طرح تھی
تکلف اک عنایت کی طرح تھا
تصور پرحنا بکھری ہوئی تھی
سماں آغوش خلوت کی طرح تھا
صدائے دل عبارت کی طرح تھی
نظر شمع شکایت کی طرح تھی
بہت کچھ کہنے والا چپ کھڑا تھا
فضا اجلی سی حیرت کی طرح تھی
کہا دل نے کہ اس کو بڑھ کے چھولوں
ادا خود ہی اجازت کی طرح تھی

نہ آیا وہ مرے ہمراہ یوں تو
مگر اک شے رفاقت کی طرح تھی

لباس کو علامت، بدن کو عبارت، فضا کو صیقل ساعت، سکوت کو امانت، ادا کو موجِ تحسین، نفس کو خوشبو کی شہرت، گریزاں آنکھ کو دعوت، تکلف کو عنایت، تصور کو بکھری ہوئی حنا، اور سماں کو آغوش خلوت کہہ کر مرئی اور غیر مرئی کا نہایت عمدہ ربط و تعلق قائم کیا گیا ہے۔ ان اشعار کو پڑھ کر ذہن و دل پر جو کیفیات مرتسم ہوتی ہیں اور بدن کے ہر ایک خلیے میں جو تحرک پیدا ہوتا ہے وہ احساس و نظر کی خوش سلیقگی اور زبان کے خلاقانہ استعمال پر دسترس کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اردو کے نئے شعری منظر نامے میں بانی کے کلام کی یہ خصوصیات اضافے کا حکم رکھتی ہیں جن سے صرفِ نظر کرنا آسان نہیں۔ ایسے کلام کی تفہیم و تشریح کی ضرورت سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ کلام جس نوع کا ہے، اس کے پیش نظر اس کی سطحی تشریح کی کوشش بہت بارآور نہیں ہو سکتی۔ فن کار نے فنی اور موضوعاتی دونوں سطحوں پر جن گوشوں کا احاطہ کیا ہے، تشریحی عمل اس میں اضافہ تو نہیں کر سکتا، یہ ضرور ممکن ہے کہ شعری حسن کا سماں کچھ دیر کے لیے نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔ ظاہر ہے یہی مرحلہ پریشان کن ہوگا۔ نئی شاعری کا یہ ابتدائی تجربہ اسی تسلسل کا حصہ ہے جس پر کئی صدیاں گزر چکی ہیں۔ بقول محمود ہاشمی:

> ''بانی کا ہر شعر ایک ایسی حرکی (Dynamic) کائنات پیش کرتا ہے، جس میں مفاہیم کا ایک بے پایاں سمندر موجود ہے۔ یہ مفاہیم نہ صرف یہ کہ ہمہ جہتی ہیں بلکہ ان کی تشکیل کے لیے ایسا اسلوب اختیار کیا گیا ہے، جو لفظ کی کائنات کو قوت، حرکت اور حرارت بخشتا ہے، جدید غزل کی انفرادی خصوصیت اور شناخت کے تمام عوامل ان غزلوں میں موجود ہیں اور یہ ابتدا ہیں غزل کے اس بالغ عہد کی، جس کی تشکیل اور تخلیق میں کئی صدیاں صرف ہو چکی ہیں۔''

(حرف معتبر، ص:12)

بانی کے بیشتر نقادوں نے ان کے پیرایۂ اظہار اور زبان و بیان کے خارجی وسیلوں کا اعتراف کیا ہے اس ضمن میں بانی کی استعمال کردہ علامتوں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ چونکہ جدید شاعروں نے جس فنی التزام کو از خود اپنے اوپر عائد کر رکھا تھا اس التزام خصوصاً علامت، استعارہ اور ترکیب سازی سے بھرپور شاعری اگر کہیں ملتی ہے تو وہ بانی کا کلام ہی ہے۔ بانی سے قبل ناصر کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی اور بانی کے معاصر ظفر اقبال کے یہاں نئی علامتوں کو تلاش کرنے اور انھیں شاعری میں برتنے کا خصوصی التزام دکھائی دیتا ہے البتہ بانی نے اس کو اپنے شعری شعور کا اس طرح سے حصہ بنالیا کہ اب اس کے بغیر بانی کی شاعری کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے بانی کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ان کے بقول پہلا دور تو وہ ہے جب وہ اپنا محاورہ تلاش کر رہے تھے، اس وقت انھیں نئے کی جستجو تھی، لیکن نئے کی پہچان نہ تھی۔ دور دوم میں انھوں نے چند غزلوں کے سوا 'حرف معتبر' اور 'حساب رنگ' کا پورا کلام شامل کیا ہے۔ فاروقی کے بقول اس دور میں بانی کو الفاظ پر قابو اتنا برجستہ نہیں تھا بلکہ الفاظ کو نئے میل کے ساتھ استعمال کرنے کی کوشش میں ایک خفیف سی لڑکھڑاہٹ ملتی ہے۔ عکس لاتفسیر، پیکر صد لمس، تشریح زائل اور قرب تہی لمس جیسی تراکیب فاروقی نے بطور مثال پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ترکیبیں اپنے تمام وزن و وقار کے باوجود معنی کو پوری طرح ادا نہیں کرتیں لیکن یہ کیفیت بہت دیر تک نہیں رہتی بلکہ 'حساب رنگ' میں ایک آدھ جگہ کے علاوہ کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ زبان نے شاعر کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ تیسرا دور حساب رنگ کے بعد کا ہے مگر یہ دور بہت مختصر ہے۔ حساب رنگ کے بعد کا کلام نئی نئی منزل کا پتہ دیتا ہے۔ فاروقی کے بقول اس دور کی سب سے نمایاں تبدیلی اسلوب کی نہیں بلکہ جہت کی ہے۔

فاروقی کی اس تجزیاتی تحریر اور بانی کے کلام دونوں سے بانی کے شعری سفر کے تدریجی ارتقا کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ 'حرف معتبر' (1971) اور 'حساب رنگ' (1974) کی اشاعت میں پانچ سال کا وقفہ ہے۔ کسی بھی فن کار کے لیے یہ مدت بہت زیادہ نہیں ہے۔ لیکن پانچ برسوں کے وقفے کے بعد 'حساب رنگ' کا پہلا ہی شعر پڑھ کر خود اعتمادی اور تخلیقی فضا کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہ بھی باور کرنا پڑتا ہے کہ بانی کو اپنے موجودہ رویے پر اطمینان نہیں ہے بلکہ امکانات کی دنیا ابھی اس کی گرفت سے باہر ہے۔

پیہم موج امکانی میں
اگلا پاؤں نئے پانی میں

'حساب رنگ' میں بانی نے چھوٹی بحروں کا تجربہ زیادہ کیا ہے۔ 'شفق شجر' کی ابتدائی پانچ غزلیں ایک نئے تجربے سے ہمیں آشنا کرتی ہیں۔ جہاں بے کرانی اور ایک طرح کی خلش کا اظہار ہے۔ متکلم دونوں دنیاؤں کی سیر کرتا ہے مگر اس کا احساس ہے کہ یہاں اپنا کچھ نہیں ہے۔

ہری سنہری خاک اڑانے والا میں
شفق شجر تصویر بنانے والا میں

لیکن اسے یہ احساس ضرور ہے کہ پہلے سے بنے بنائے راستے کام نہیں آسکتے مجھے تو نئی دنیا تلاش کرنی ہے جہاں سب کچھ میرا ہو۔

چلی ڈگر پر کبھی نہ چلنے والا میں
نئے انوکھے موڑ بدلنے والا میں

اردو غزل کی تاریخ کے ہر موڑ پر فن کاروں کی قوت تخلیق نے ہی اسے نئے راستوں پر گامزن کیا۔ فکر و دانش اور ہیئت و اسلوب کے نئے نئے تجربوں سے ہم کنار کیا اور اسی لیے غزل کی مقبولیت و محبوبیت ہر عہد میں برقرار رہی۔ شعری اصناف میں صرف غزل ہی وہ صنف ہے جو لسانی جمہوریت کی توسیع کا سب سے بڑا ذریعہ ثابت ہوئی۔ بانی کے اشعار کو پڑھتے وقت ہم جن کیفیات اور احساسات سے دوچار ہوتے ہیں، ان کا تعلق فکر اور فن دونوں سے ہے۔ ہمارے زمانے میں ایسے شعرا بہت کم ہیں جنھیں موضوع اور فن دونوں حوالوں سے یکساں اعتبار ملے۔ چیدہ چیدہ اشعار کی تفہیم و تشریح کے ذریعے فکر و فن کے ان حوالوں تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے جو بانی کا طرۂ امتیاز قرار دیا جاسکتا ہے۔ جدید غزل سے پہلے کا جو عام شعری ماحول تھا اس میں اس طرح کی شاعری بڑے دل گردے کا کام تھا کیونکہ بانی کے زمانے تک آتے آتے ادب

اور سماج کے رشتے کی بحث زیادہ طول پکڑ چکی تھی۔ بانی اور ان کے زمانے میں اس طرز کے بعض دوسرے شعرا کی تخلیقی ہنرمندی نے غزل کے نئے طرز و اسلوب کو عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ سطور بالا میں بانی کے جن اشعار کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ بانی کے یہاں بھرپور تخلیقی توانائی تھی اور اس پر انھیں اعتماد بھی تھا۔ پروفیسر عتیق اللہ کے بقول:

> ''بانی کی غزل کے پس پشت ایک ایسا ذہن کارفرما نظر آتا ہے جو کہ مرتب اور محفوظ ہے اور جو فنی ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ ان غزلوں میں خارجی تراش، جذباتی ارتکاز کو راہ دیتی ہے جس کے نتیجے میں غزل جذباتی انتشار اور معمولی جذبات کی طفیلی نہ ہو کر ایسے خیال، جذبے اور فکر کو اپنی شخصیت میں جذب کرتی ہے جو مکانی ہونے کے باوجود لامکانی اور زمانی ہونے کے باوجود لازمانی لمحات کو محیط ہو۔''

(حساب رنگ، ص:9)

ان اشعار کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بانی پیہم متحرک رہنے والا تخلیق کار ہے۔ جس نے زبان و بیان کے نامیاتی عمل کو شعری اظہار کے اساس کے طور پر برت کر جہانِ معنی کی بسیط کائنات کو روشن و تابندہ کیا۔ بانی نے نئی شعری روایت کے بالکل ابتدائی دور میں ہی علامتوں، پیکروں اور شعری تراکیب سے اپنی خلّاقیت کا ثبوت فراہم کیا۔ چنانچہ نئی شاعری کو ایک مستحکم پیرایۂ اظہار بھی مل گیا۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ بانی نے نئی شاعری کے نکتہ چینوں کو اپنے تعصبات و تحفظات پر از سرِ نو غور و فکر کرنے کی طرف مائل کیا۔

بانی کی نظم نگاری

اردو نظم نگاری کے کچھ کچھ سراغ تو جعفر زٹلی کی ہجو یہ شاعری سے ہی ملنے لگتے ہیں البتہ نظیر اکبرآبادی کی حیثیت بنیاد گزار کی ہے۔ ان کو اپنے زمانے میں مقبولیت اور اعتبار تو نہیں ملا البتہ رفتہ رفتہ ان کی اہمیت مسلم ہوتی چلی گئی۔ مذہبی، سماجی اور دیگر خوشیوں و تہواروں سے متعلق ان کی نظمیں آج بھی زندہ ہیں۔ موجودہ تناظر میں جبکہ باہمی اخوت و محبت اور رواداری کے جذبے کو مستحکم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے اور فرقہ واریت سے ملک کو بچانے کی تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں نظیر اکبرآبادی کی نظموں کی مقبولیت پہلے کے مقابلے اور بڑھ گئی ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا محمد حسین آزاد نے شعوری کوشش کے ساتھ نظم نگاری کو فروغ دیا۔ انجمن پنجاب لاہور کے تحت پہلی بار مشاعروں کے بجائے مناظمہ کا آغاز ہوا، جس میں شعرا کو موضوع دیا جاتا تھا جس پر وہ نظمیں لکھ کر لاتے تھے۔ نظم نگاری کی یہ کوششیں ترقی پسند تحریک کے دوران زیادہ بار آور ثابت ہوئیں۔ تحریک سے وابستہ شعرا نے غزل کے بجائے نظم کو اپنے شعری اظہار کا وسیلہ قرار دیا۔ مقصد اور ایک خاص تصور ادب کے سبب سے ترقی پسند تحریک کے لیے صنف نظم ہی مناسب تھی اور یہی راس بھی آئی۔

نظم نگاری کی یہ ساری کوششیں ایک خاص جذبے اور مقصد کے تحت کی گئیں۔ مولانا الطاف حسین حالی اور ترقی پسند تحریک کی نظموں میں بیانیہ اسلوب مشترک ہے۔ ان نظم نگاروں کے یہاں

پیچیدگی یا تہہ داری کا فقدان تھا۔ جو شعری روایت انھیں ورثے میں ملی تھی اسی تسلسل کو انھوں نے برقرار رکھا۔ جدیدیت کے شعری رجحان سے قبل بالعموم نظم نگاروں کے یہاں موضوع کی مناسبت سے نظم کا آغاز، کلائمکس اور اس کے بعد نظریے کے مطابق نظم کا خاتمہ ہوتا تھا، ان نظموں کی قرأت بھی آسان ہوتی اور ان کا سمجھنا بھی۔ نظم نگاری کی یہ روایت ہمارے شعور کا حصہ بن چکی تھی۔ اس لیے ذہنی اعتبار سے نظم کے اس رویے سے لوگ ہم آہنگ ہو چکے تھے۔ اگر کہیں کسی مصرعے میں پیچیدگی یا اشکال بھی ہوتا تو ذہنی ہم آہنگی کی وجہ سے وہ نظمیں بہت جلد سمجھ میں آ جاتیں۔ تاہم ن۔م۔ راشد اور میراجی کی نظموں کی تفہیم اور تجزیے کے سلسلے میں جن دشواریوں کا سامنا رہا اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ لوگ جس طرح کی نظمیں پڑھنے کے عادی تھے میراجی اور ن م راشد کی نظموں کی شعریات ان سے بالکل مختلف تھیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ حالی اور ترقی پسند تحریک کی نظموں سے یہ نظمیں بالکل مختلف تھیں۔ ان نظموں کی بنیادی صفت سریت، پیچیدگی اور داخلیت ہے۔ جدیدیت کے رجحان کے زیر اثر جب نظموں کے تجربے شروع ہوئے تو وہاں بھی یہی فکر اور اسلوب نمایاں رہا۔

جدیدیت کے اولین شعرا میں بالخصوص بانی کا نظمیہ لہجہ بھی پراسراریت اور داخلیت سے لبریز رہا۔ شروع شروع میں ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے سبب کسی نے ان نظموں کو چونکانے والا تجربہ سمجھا تو کہیں یہ لاحاصل کوشش قرار پائی۔ حالانکہ جدیدیت کے شعری تجربوں کا غائر مطالعہ کرنے پر راز کھلتا ہے کہ چاہے وہ نظم ہو یا غزل، ہر سطح پر ان شعرا کا رویہ اور تجربہ ماقبل کے شعرا سے یکسر مختلف رہا ہے۔ فنی اور شعری اساس ہی ان کے شعری تجربوں کی کلید ہے۔ فکر و خیال کی لامحدود وسعتوں میں کچھ پانے کی تمنا انھیں لفظ اور خیال دونوں سطح پر کلاسیکی سرمایے سے اخذ و قبول کی طرف لے جاتی ہے جس کا سلسلہ درمیان میں کچھ عرصہ کے لیے قریب قریب ختم ہو گیا تھا۔ ان حوالوں سے جب ہم نئی نظم کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ کلید ہاتھ آتی ہے جن سے ان نظموں کی عقدہ کشائی بہ آسانی ہوتی ہے۔ بانی کی غزلیہ شاعری کی طرح ان کی نظم نگاری بھی فنی در و بست سے آراستہ ہے۔ جو حقیقت، مجاز، مرئی، غیر مرئی اور ناقابل تشریح اشیا کو گرفت میں لینے کی کوشش سے عبارت ہے۔ ان نظموں میں کہیں واضح کہیں مدھم اور کہیں آدھا ادھورا خاکہ مرتب کیا گیا ہے اور کہیں ان کی

پشت پر اساطیری اور تاریخی حوالوں کی کارفرمائی ہے۔

بانی کی شہرت اور شناخت غزل سے وابستہ ہے۔ان کے شعری سرمایے میں نظموں کی تعداد صرف 24 ہے۔آخری مجموعۂ کلام میں صرف غزلیں ہی ہیں جبکہ حرف معتبر میں سولہ اور حساب رنگ میں آٹھ نظمیں شامل ہیں۔بانی کی شاعری پر چند ایک جو اچھے مضامین لکھے گئے وہ ان کی غزلیہ شاعری کے حوالے سے ہی ہیں۔'حساب رنگ' کے دیباچے میں پروفیسر عتیق اللہ نے بانی کی غزلیہ شاعری کے فن اور موضوع کا احاطہ کرتے ہوئے مضمون کے آخری پیراگراف میں ان کی نظموں کو بھی موضوع گفتگو بنایا ہے۔انھوں نے بانی کی نظموں کو غزل کے تخلیقی اسلوب کی توسیع قرار دیا ہے۔'حساب رنگ' کی بیشتر نظمیں اپنے ڈکشن کے اعتبار سے فاری کے انہی مرکبات سے بجی ہوئی ہیں جو بانی کے غزلیہ اسلوب کا خاصہ ہیں۔'حرف معتبر' کی بیشتر نظموں کے مصرعے طویل ہیں۔البتہ 'حساب رنگ' کی نظموں کے مصرعے بہت ہی مختصر ہیں۔'حرف معتبر' میں مرکبات بھی بہت کم ہیں بعض نظموں میں طنزیہ لہجہ بھی نمایاں ہے۔اس مجموعے میں شامل نظم 'معمول' موضوع کے اعتبار سے فیض کی نظم تنہائی کی یاد دلاتی ہے۔'عورت کتا اور پڑوس' میں طنز کی زیریں لہریں کارفرما ہے۔بانی کی یہ واحد نظم ہے جو نظم معری کے ذیل میں آتی ہے جبکہ بقیہ تمام نظمیں آزاد ہیں۔

'حرف معتبر' کی نظموں کو پڑھ کر 'شفق شجر' میں شامل شمس الرحمٰن فاروقی کا دیباچہ یاد آتا ہے جس کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے:

> ''بانی کی شاعری تین ادوار میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔پہلا دور تو وہ ہے جب وہ اپنا محاورہ تلاش کر رہے تھے۔اس وقت انھیں نئے کی جستجو تھی، لیکن نئے کی پہچان نہ تھی یا یوں کہیے کہ انھیں نئے تک پہنچنے کا راستہ صاف نظر نہ آتا تھا۔''

(شفق شجر،ص:24)

فاروقی کی یہ تحریر بانی کے پس از مرگ شائع ہونے والے مجموعۂ کلام 'شفق شجر' میں شامل

ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فاروقی نے بانی کی پوری شاعری کو سامنے رکھ کر یہ کلیہ پیش کیا ہے۔شعرادب کا شعور رکھنے والا کوئی بھی شخص دونوں مجموعۂ کلام کی نظموں کو سامنے رکھ کر آسانی سے اندازہ کرسکتا ہے کہ 'حساب رنگ' تک آتے آتے بانی کے اسلوب میں کس درجہ ٹھہراؤ اور اعتماد پیدا ہو گیا تھا۔

جدیدیت کے تخلیقی بنیاد گزاروں میں بانی اور زیب غوری کا نام سرفہرست ہے۔سریت، ابہام اور پیچیدگی ان کا خاص شعری جوہر ہے۔یہی جوہر بانی کی ان نظموں میں بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ان نظموں کا داخلی رویہ ناآسودگی اور بےقراری کا ہے۔اس کے اظہار کی صورت گری لفظوں کے وسیلے سے بانی نے ضرور کی ہے۔مگر یہ اظہار صفحۂ قرطاس پر اتنا واضح اور کھلا ہوا نہیں ہے مگر قاری کے ذہن میں یہ لفظ نئی صورتیں اور شکلیں اختیار کرتے ہیں۔کہیں کہیں لفظوں کی تجسیم جو انسان کی شکل میں ہوتی ہے وہ آدھا ادھورا ہوتا ہے یا پھر اتنا بےقرار اور مضطرب کہ اس کی کوئی واضح شکل ذہن میں نہیں بن پاتی۔حرف معتبر کی پہلی نظم 'پناہ کہیں ملے' کا آغاز اس طرح ہوتا ہے ؎

شب کی آوارہ ہوا
ایک ڈائن کی طرح
آسمانوں سے چرالائی ہے گم گشتہ صدائیں
عرصہ آفاق کا تاریک شور!

ڈائن کی کوئی واضح شکل نہیں بلکہ اس لفظ سے پراسراریت اور خوف ناکی کا عنصر زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔اسی ڈائن کو بانی نے شب کی آوارہ ہوا کہا ہے جسے سکون کی تلاش ہے۔ڈائن اور ہوا کی ایک مشترک صفت آوارگی ہے، ان کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ہوا کی صفت بےقراری ہے اور یہی ڈائن کی بھی۔دونوں کو سکون اور اطمینان کی تلاش ہے، جس کے لیے وہ ہمیشہ سرگرداں رہتے ہیں۔لیکن یہ ان کا مقدر نہیں۔بانی کی فن کاری یہ ہے کہ وہ کبھی کبھی اشیا کے بنیادی جوہر کو پریشانی کا سبب بنا دیتے ہیں۔یہاں بھی یہی چیز کارفرما ہے۔

نظم میں ہوا شب کا سکون چاہتی ہے مگر اس کا اپنا کوئی بستر نہیں۔ڈائن وہی ہے جو ادھوری خواہش رکھتی ہو۔ایسی ادھوری خواہش جو کبھی پوری نہ ہوسکے۔گم گشتہ صدا ڈائن کی مناسبت سے

بھوت کو قرار دیا جاسکتا ہے۔شب کی آوارہ ہوا دراصل ان روحوں کی بازگشت ہے، جن کی خواہش پوری نہیں ہوئی یہاں ہوس بمعنی جنسی خواہش بھی ممکن ہے۔

اجنبی دیسوں کے پیڑوں سے
اڑا لائی ہے پتے...
سسکیاں بھرتے ہوئے!
تھک چکی ہے

پتوں کے اڑنے سے ٹکرانے کی آواز، جو سسکیاں بن کر نکل رہی ہے۔ ہوا اضطراب اور حرکت سے عبارت ہے اور پتے اس میں رکاوٹ پیدا کر رہے ہیں اس لیے ہوا تھک رہی ہے جس کی وجہ سے اس میں ٹھہراؤ پیدا ہو رہا ہے۔اور یہی ہوا کی تھکن ہے۔

ایک ایسا شخص جو جنسی جذبے یا ہوسناکی کی وجہ سے مجبور ہے۔اس پر عجیب وغریب کیفیت طاری ہو رہی ہے۔یہاں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ جنسی عمل زندگی کا تسلسل ہے کیونکہ ایک وجود دوسرے وجود کو لانے کا ذریعہ بنتا ہے رکاوٹ کی وجہ سے اضطراب ہے اور سکون اسی وقت ملے گا جب زندگی کا تسلسل جاری رہے۔نظم کا اختتام ان مصرعوں پر ہوتا ہے۔

ڈھونڈتی ہے کوئی دروازہ کھلا
کوئی کھڑکی ادھ کھلی
کوئی بستر... جو کسی کے واسطے خالی پڑا ہو۔

'معمول' کا موضوع فیض کی نظم 'تنہائی' جیسا ہے۔البتہ تنہائی میں بصری پیکر اور نظم کی ایک خاص کیفیت نے حسن پیدا کر دیا ہے ورنہ انتظار کی صورت دونوں جگہ یکساں ہے۔'معمول' کا المیہ بوڑھی ماں کا جواں سال اکلوتا بچہ ہے، جو دیر رات کو واپس آتا ہے نظم کے آخری تین مصرعے غیر معمولی ہیں۔

اور بے آہٹ سڑک
جانتی ہے...

کس کے قدموں سے ابھی محروم ہوں!

'ہر جادۂ شہر' شہری زندگی کے المیے پر مبنی ہے۔ جہاں روزی روٹی کے لیے آنے والا انسان ان صفات سے محروم ہو جاتا ہے جس کی بدولت اسے اشرف المخلوقات کہا گیا۔ لیکن یہاں انسانی ہوس کو نہ اقدار و تہذیب کا پاس و لحاظ ہے اور نہ آنکھوں میں مروت جو انسان کا خاصہ ہے۔ بلکہ شہری مشین کل پرزے کے طور پر کام کر رہا ہے جہاں ایک ایک لحہ قیمتی ہے۔ لیکن شاید اسے نہیں معلوم کہ زندگی مشین بننے اور مسلسل کام کرنے کا نام نہیں بلکہ ہم نے اپنے معیار و اعتبار کے لیے کچھ ایسے نشانے مقرر کر لیے ہیں، جو ہمیں کسی پل سکون نہیں دیتے۔ نظم ان مصرعوں پر ختم ہوتی ہے۔

ہانپتی تہذیب کے اک اک مسافر سے کہے گی
دوڑتے جاؤ..... یہی ہے زندگی
مت رکو اک دوسرے کے واسطے
بھاگتا ہے وقت
لیکن
لحہ لحہ
دوڑنا ہے سب کو
لیکن تنہا تنہا!

ان مصرعوں میں بانی کے ذہنی رویے اور تہذیب و اقدار کے تئیں حساسیت کو صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

'عورت، کتا اور پڑوس' جو نظم معریٰ کے ذیل میں آتی ہے۔ نظم بہت رواں اور شعری مرکبات سے عاری ہے۔ سطور بالا میں جیسا کہ عرض کیا گیا 'حرف معتبر' کی نظموں میں بیک وقت کئی اسلوب کارفرما ہیں اور یہ نظم ان سب سے الگ اور منفرد ہے۔ اس میں طنز کی ہلکی لہر ہے۔ اضطراب اور بے زاری اس نظم کا نمایاں عنصر ہے۔ عورت پڑوسیوں سے بے زار ہے۔ انسان کے بجائے اس کا جھکاؤ اور میلان کتے کی طرف ہے۔ عام لوگ خوف کے باوجود عورت کی لحہ بھر کی مسرت کو نہیں چھیننا چاہتے۔

ابدیت پانچ مصرعوں کی مختصر سی نظم ہے۔

... مگر میری زندگی کے آنگن میں
سیکڑوں بے سحر شبیں
ایک ڈھیر بن کر سلگ رہی ہیں...
اگر چہ سو بار پو پھٹی ہے
اگر چہ سو بار دن ہوا ہے

مدعا صرف اتنا ہے کہ ابدیت کسی شے کو حاصل نہیں ہے۔ البتہ ہماری ذات جو کہ ہمارے ساتھ ہے وہ لازوال ہے، ابدیت اسے حاصل ہے۔ 'بساط اظہار' یہ نظم 'من تو شدم تو من شدی' کے نظریے پر استوار کی گئی ہے۔ یہ اس نظم کا طرز اظہار اور الفاظ کی بندش بہت چست ہے۔ کسی بھی چیز سے بہت زیادہ قربت درست نہیں ہے۔ فاصلہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس سے تصویر صاف نظر آتی ہے۔ آنکھ سے بالکل قریب کر دینے سے کوئی بھی چیز نظر نہیں آئے گی۔ 'بساط اظہار' میں متکلم اپنی اظہار کی طاقت سے اس کی سماعتوں کو اپنانے اور اس تک اپنی ترسیل کرنے پر قادر ہونا چاہتا ہے لیکن اصل مسئلہ قربت کا ہے اسی لیے ترسیل نہیں ہو پا رہی ہے۔ سماعت کی دقت کی دشواری ہے لیکن اس کے لیے وہ ازل سے کوشاں ہے۔

جا دوئے اظہار کا ایک ایک فتنہ
میرے ہونٹوں سے چمٹ کر رہ گیا ہے

اظہار کے دوسرے سرے تک نارسائی کی وجہ قربت ہے اور یہی قربت جب ختم ہو گی تو میں تجھ میں ضم ہو جاؤں گا اور اپنے وجود کو تیرے وجود میں تحلیل کر دوں گا۔

جدیدیت سے وابستہ شعرا فنی اور فکری اساس کے لیے کوشاں تھے۔ یہ نظم اس کی خوب صورت مثال کہی جا سکتی ہے۔ فن اور فکر کے توازن سے تخلیقی عمل کو بروئے کار لانا بانی کے زمانے میں بہت مشکل تھا اس وقت تو ''حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو'' کا نعرہ بلند ہو رہا تھا اور جدیدیت کی فکر اور اس سے وابستہ شعرا مطعون تھے۔

'جینا ہے مجھے' نظم پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کی تخلیق کے پس پردہ یہ سوچ ضرور کارفرما رہی ہوگی کہ جدیدیت پر جس مریضانہ ذہنیت، مایوسی اور اضمحلال کا الزام عائد کیا جا تا رہا ہے وہ درست نہیں ہے۔ اس الزام کو سامنے رکھیے اور نظم کے تیور کو دیکھیے۔

پھر خیال آیا کہ جینا ہے مجھے...
جس طرح اک تھکا ماندہ پرندہ
لاکھ ہو برف بہ جاں/لاکھ ہو آہستہ سفر

اس کا مقصد اور نصب العین جینا ہے۔ حالات چاہے جیسے بھی ہوں۔ صورت حال کیسی ہی ہو اسے اس کا مقابلہ کرنا ہے اور اپنے وجود کے اثبات کا اعلان کرنا ہے۔ اسے مقصد اور نصب العین سے گہرے عشق اور تعلق کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ یہاں قابل غور پہلو یہ ہے کہ نظم جدیدیت کو تخلیقی اساس فراہم کرنے والے شاعر بانی کی ہے وہ مایوس ہو کر فیض احمد فیض کی طرح یہ نہیں کہتا کہ ؎

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے

بلکہ وہ کہتا ہے کہ ؎

ایک بلندی پہ تو ہوتا ہے ضرور
زیر پرواز کوئی گہرا سمندر ہے تو کیا
اسے اوپر سے گزر جانا ہے!!

موت اور زندگی ایک سکے کے دو رخ ہیں۔ صورت حال بدلتی ہے، چیزیں وہی رہتی ہیں۔ پرندے کا اصل جہاں آسمان ہے مگر اس کے وجود کے ساتھ عدم کا گہرا سمندر ہے، جس طرح پرندہ سمندر میں نہیں گر سکتا اسی طرح روح عدم میں نہیں رہ سکتی۔ کشمکش کا ایک جہانِ بسیط جس میں آزار، دکھ اور نہ جانے کیا کیا ہے مگر فن کار کی ساری توجہ اس امر پر مرکوز ہے کہ آسمان و زمین کے اس گہوارے میں انسان پرندے کی طرح قید ہے بلندی اس کا مقدر ہے مگر آنا تو زمین پر ہی ہے۔ زندگی اور موت کی کشمکش نظم کا بنیادی عنصر ہے۔ اقبال نے کہا ہے۔

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

'حرف معتبر' کی یہ نظمیں اپنے بیان اور موضوع کے اعتبار سے بہت مختلف اور منفرد ہیں۔ پڑھنے والا ایک خاص طرح کے لطف کے ساتھ ساتھ ہمہ جہت فکر اور اسلوب سے دوچار ہو گا۔ابہام باقی کا خاص جوہر ہے اس لیے جگہ جگہ اس کے اثرات نمایاں اور واضح ہیں۔ البتہ اس سے معنی کی ترسیل میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔نظموں کا ایک خاص رجحان اور خاص موضوعاتی دائرے جن کے ہم عادی تھے یہاں نہیں ملیں گی۔بسا اوقات ان نظموں پر نثری نظم کا بھی گمان ہوتا ہے بطور خاص 'حرف غیر' پڑھ کر۔لیکن جیسا کہ کہا گیا کہ باقی کا رویہ اور فنی برتاؤ عام شعرا سے بالکل مختلف اور الگ تھا اور یہ رنگ ان کی نظموں میں بھی نمایاں ہے۔

گزشتہ سطور میں جیسا کہ لکھا جا چکا ہے نظم نگاری کی وہ روایتیں جو ہمارے یہاں عرصہ سے چلی آ رہی تھیں باقی تک آتے آتے ان کا اسلوب بالکل بدل گیا۔باقی کے نظمیہ کلام کے مطالعہ کے دوران یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ 'حرف معتبر' کی نظموں کے مقابلے 'حساب رنگ' کی نظمیں زیادہ پیچیدہ اور مشکل ہیں۔اوپر میں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان نظموں کے مصرعے بہت مختصر ہیں اور یہ نظمیں 'حرف معتبر' کے مقابلے زیادہ طویل ہیں۔'حساب رنگ' کی پہلی نظم کا عنوان '31 دسمبر' ہے۔یہ نظم قاری کو اپنے مقاصد پھر سے طے کرنے پر ہی نہیں ابھارتی بلکہ نئے سال میں نئے عزم کے ساتھ چیزوں کے پانے کی کوشش سے بھی عبارت ہے۔جو کچھ ہو چکا ہے اس پر افسوس یا ندامت کے بجائے نئے موسم اور نئے امکان کو بروئے کار لانے کا سراغ دیتی ہے۔ابتدائی چند مصرعے دیکھیں۔

اے خبر تشنہ
وضاحت زخم
معنی کے پرندے
سبز، سیندوری
طلائی سرمگیں ریشم
ترے چاروں طرف دامِ حروف

معنی تک رسائی کے لیے یا اس کو قید کرنے کے لیے حروف و الفاظ جال بنے ہوئے ہیں جو مختلف رنگ کے ہیں۔ معنی کا پرندہ جال میں ہے اس لیے کہا کہ 'جھانک تقدیس زیاں' زندگی کو معنی بخشنے کے لیے نئے سال پر جو کچھ تیاری ہو رہی ہے اسے اچھی یا مثبت توقعات کہہ سکتے ہیں کیونکہ گزرا ہوا ماضی بھی 'تقدیس زیاں' ہے اور سال گزشتہ کا تجربہ بھی زیاں تھا۔

اور توانائی تراشیدہ پروں پر
ٹانک خواہش کے غبارے
آسمانی استعارے
طے شدہ مفہوم

زیر دام آنے کے بعد پرندوں کے پر کترے ہیں تا کہ وہ گرفت میں رہیں۔ پر کترنے کے بعد فضا محدود کی، معنی متعین کیے۔ ان پر نئی خواہش کے غبارے ٹانکنا دراصل بلندی پر جانے کی خواہش سے عبارت ہے۔ اور یہی خواہش کے غبارے آسمانی استعارے ہیں۔ زمین کے معنی میں قید ہونے کے بعد یہاں کے الفاظ کو آسمانی استعارے کے ذریعہ بلند کیا جائے اور یہاں کے معنی کو بھی آسمانی معنی میں استعمال کیا جائے انھیں بلندی کا درجہ دیا جائے۔ زمین اور استعارے کی مناسبت سے ہی... طے شدہ مفہوم...... مصرعہ ہے .... جھانک روشن آنکھ سے.... ماورائی مفہوم کو طے شدہ مفہوم میں ڈھال دیا ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خدا کو اگر انسانی مفہوم میں دیکھا جائے تو خدا بھی... نظر آئے گا۔ اسے حقیقت کا عرفان بھی کہہ سکتے ہیں۔ جس کے بعد دل کی آنکھ روشن ہوتی ہے بصارت کے ساتھ بصیرت کی بھی توفیق ملتی ہے جس کے بعد پر اسرار آفاق کے آبی دھوئیں کو جھانکنا کارعبث ہے کیونکہ وہاں کچھ نظر ہی نہیں آئے گا لیکن اس سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ خلا میں یا پر اسرار آفاق میں کچھ نظر نہیں آتا تو کیا ہوا تم اپنے وجود پر غور کرو اسے دیکھو۔

دل نہ کر لیکن اداس
دیکھ اپنے پاؤں کے اوپر نئے

آراستہ
فصل گداز...
اجلی کپاس!!

موجودہ صورت حال کے ازالے کے لیے خوش آیند چیزوں کی طرف دیکھو آفاق پر اسرار دراصل مستقبل ہے جو نظر نہیں آرہا ہے۔ غیر طے شدہ ہے۔ خواہش کے غبارے پہلے ہی ٹانک چکا تھا، جس میں سب کا پورا ہونا ممکن نہیں اسی لیے اداسی لازمی ہے۔ اس کو ختم کرنے کے لیے اپنے گردوپیش اور آس پاس کی چیزوں پر نظر ڈالنے اور ان پر غور کرنے کا حکم دے رہا ہے۔ 'پاؤں کے اوپر تلے' جغرافیائی اور آس پاس کا ماحول ہوسکتا ہے، جس میں آراستگی ہے۔ اجلی کپاس نئے موسم یا امکان کا استعارہ ہے، جو ایک حالت پر قائم نہیں رہے گی۔ اس نظم میں شعری مرکبات کے بہت سے نادر نمونے ہیں جو فکر اور اسلوب کی تازہ کاری پر دلالت کرتے ہیں۔

مجموعے میں شامل ایک نظم 'ادھر کی آواز اس طرف ہے' کو پڑھنے پر یہ تاثر ابھرتا ہے کہ اس نظم کی تعمیر اور تشکیل میں تاریخی اور اساطیری واقعات کا سہارا لیا گیا ہے۔ مگر یہ سہارا بہت واضح نہیں بلکہ اس کا عکس ہے، جو کہیں روشن اور کہیں بہت مدھم ہے۔ البتہ نظم کی قرأت کے دوران ذہن میں یہ واقعہ ابھرتا ضرور ہے۔ نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

اجاڑسی دھوپ
آدھی ساعت
کہ نامکمل علامتیں
داغ داغ آنکھیں
یہ ٹیلہ ٹیلہ
اترتی بھیڑیں
کہاں ہے
جو ان کے ساتھ ہوتا تھا
اک فرشتہ

دھوپ اور ساعت میں ملاپ نہیں۔ دھوپ جسم کے طور پر ہے مگر اس کی روح اور معنی نہیں ہے۔ علم نجوم میں ساعت بطور اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ جس سے اجسام پر مثبت اور منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اسی لیے ساعت کے ساتھ مسعود اور نا مسعود کا لفظ رائج ہے۔

بدگمانی سے ہوا طفل برہمن کیوں گرم
ساعت نیک جو پوچھی تو قیامت آئی
ہر گھڑی کانوں میں آتی ہے یہ آواز جرس
کون دنیا سے سفر کرتا ہے ساعت دیکھ کر

مگر یہاں نظم میں ساعت ہی نامکمل ہے، جس کی وجہ سے اس کے اثرات بھی نامکمل رہیں گے۔ مثبت اور منفی تو بعد کی چیز ہے۔ علامت بھی اسی وجہ سے مکمل نہیں۔ آنکھوں میں روشنی تو ہے مگر پہلے جیسی کیفیت ان کی نہیں ہے۔ روشنی کا ہالہ ایک داغ کی صورت میں نمایاں ہے۔ بھیڑیں اب بھی چرائی جاتی ہیں مگر ان کے ساتھ فرشتہ نہیں۔ ساری چیزوں کا وجود تو ہے مگر ان میں تکمیلیت نہیں ہے۔ وہ مکمل نہیں ہیں۔ ذہن یہاں حضرت موسیٰ کی طرف جاتا ہے۔ جنھوں نے بعوض ادائیگی مہر حضرت شعیبؑ کی بھیڑیں چرائی تھیں۔ یعنی زمین و آسمان کے درمیان ربط و تعلق پیدا کرنے والا فرشتہ (نیک سیرت انسان) نہیں ہے۔

کٹی پھٹی زرد
شام سے
کون بڑھ کر پوچھے
کہ ایک ایک برگ
آگہی کا
ہوا کے پہلے
لرزتے ہاتھوں سے گر رہا ہے
تمام موسم بکھر رہا ہے

جذبے کی شدت لرزہ پیدا کرتی ہے۔ شاعر یہاں خزاں کے موسم کا تصور پیش کر رہا ہے۔

خزاں ہر چیز کے اجزا کو الگ الگ کر رہی ہے۔شام کے بعد رات آنے والی ہے اور وہ درخت جس سے موسیٰ کو آگہی کا ادراک ہوا تھا اب وہ بھی پت جھڑ کا شکار ہو گیا ہے۔رات دھیرے دھیرے آ رہی ہے۔جس کا آبی منظر اور ٹھنڈک پوری وادی کے درمیان پھیلا ہوا ہے۔یہاں اس وادی کی طرف ذہن جاتا ہے جہاں ٹھنڈ میں رات گزارتے وقت روشنی کا شعلہ دیکھ کر موسیٰ آگ لینے جاتے ہیں اور پیغمبری مل جاتی ہے۔اس نظم کے کئی کلیدی لفظ ہیں جن سے ذہن اس واقعے کی طرف جاتا ہے۔وادی میں وادی اس طرح ہے کہ ایک پیالہ بن گئی ہے۔وادی کے آبی منظر سے ٹھنڈ کا احساس ہوتا ہے۔پس پشت وہ واقعہ جس کا ذکر گزشتہ سطور میں کیا جا چکا ہے۔'خنک سا شیشہ' میں اگر لفظ شیشہ کے معنی آئینے کے لیں تو آتی شب کا آبی منظر منعکس ہو رہا ہے۔آوازوں کا صرف ایک طرف ہونا

اگر ادھر کی صدا ہے کوئی

تو اس طرف ہے

اِدھر کی آواز

اس طرف ہے

جس نامکمل ساعت سے نظم کا آغاز ہوا تھا خاتمہ بھی نامکمل احساس کا غماز ہے۔اس لیے آوازوں کی تقسیم منطقی ہو سکتی ہے فطری نہیں اور یہاں یہی محسوس ہوتا ہے کہ آوازوں کی بھی تقسیم ہو چکی ہے جو جدھر ہے اس کو اسی طرف کی آواز سنائی دے رہی ہے۔وسعت اور کشادہ ظرفی کے خواص انسانیت اور فطرت دونوں کے غماز ہیں یہاں متکلم ان چیزوں سے محروم ہے۔

ٹوٹتے رشتوں کا شاعر

گزشتہ سطور میں جیسا کہ کہا جا چکا ہے بانی نے اپنا شعری سفر اس وقت شروع کیا جب جدیدیت کے رجحان کا آغاز ہو رہا تھا۔ مگر اس وقت کی عام ادبی فضا اس رجحان کے لیے بہت زیادہ سازگار نہ تھی۔ مشاعروں اور رسائل کے توسط سے جو شعری سرمایہ لوگوں تک پہنچ رہا تھا اس میں مایوسی اور غصہ کی کیفیت زیادہ تھی۔ مایوسی اس بات پر کہ جن خوابوں کے لیے انھوں نے برطانوی سامراج سے آزادی حاصل کی تھی وہ اب بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو رہا تھا۔ غصہ اس بات پر کہ نیا نظام بھی عوام کی توقعات پر پورا نہیں اتر رہا تھا۔ بے اطمینانی اور پریشاں حالی کی وہ صورت حال جو بہت دنوں سے عام ہندستانیوں کا مقدر بن چکی تھی۔ اب بھی برقرار تھی۔ غالباً اسی وجہ سے آزادی کے چند سال بعد ہی جگر مرادآبادی، فیض احمد فیض اور بعض دوسرے شعرا کی ایسی تخلیقات سامنے آئیں جن میں صاف صاف کہا گیا تھا کہ آزادی کی وہ منزل ابھی نہیں آئی جس کا خواب عام ہندستانیوں نے دیکھا تھا۔ ان شعرا کا شعری رویہ اور اشعار کی ظاہری ساخت زبان و بیان کسی نئے تجربے سے عاری تھا۔ ''شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل'' جیسے اشعار کسی نئے تجربے کی یاد نہیں دلاتے۔ البتہ انہی برسوں میں بعض شعرا ایسے بھی سامنے آئے، جنھوں نے اپنے اسلوب اور پیش کش کے انداز سے اپنا گہرا تاثر قائم کیا۔ اس وقت کے مقبول عام شعری تجربوں سے الگ ہٹ کر جن میں ہنگامی موضوعات غالب تھے، بانی نے ایک نئے شعری تجربے کا آغاز کیا۔ اس

زمانے میں کم اور بعد کے زمانے میں بہت سے لوگ جدیدیت کو مطعون کرتے ہوئے کہتے رہے ہیں کہ اس رجحان نے ادب کو عام لوگوں سے دور کر دیا۔ اور اس رجحان کے تحت شاعری کرنے والوں کا رشتہ سماجی اور تہذیبی عوامل سے کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا۔ ایسے لوگ دراصل یہ بھول جاتے ہیں کہ جدیدیت کا علمبردار بھی اسی سماج میں سانس لیتا ہے اور یہاں کے ہر حسن اور قبح پر اس کی نظر رہتی ہے۔ وہ سماجی مسائل کو اپنی ذات کے وسیلے سے بیان کرتا ہے، جسے اس کی تحریر میں اس کے ذاتی محسوسات کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اور جب یہ بات طے ہوگئی کہ ادب کا خام مواد یہی معاشرہ اور سماج ہیں تو تخلیق کار کا ہنر یہی ہے کہ وہ اپنے خیالات کو الفاظ اور اسلوب کا ایسا حسن عطا کرے جو ادبی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔ لباس کا اچھا برا ہونا شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے غالباً اسی لیے حلقۂ ارباب ذوق جسے ترقی پسند نظریے کا مخالف کہا گیا تھا اس نے صاف اور کھلے لفظوں میں کہا کہ جو ادب فن کی کسوٹی پر پورا اترے گا وہ انسان دشمن اور زندگی کی اقدار سے دور نہیں ہو سکتا۔ اختر الایمان کے بقول:

> ''حلقہ ارباب ذوق کے روح رواں میراجی تھے۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا۔ ارباب ذوق کا حلقہ ترقی پسند تحریک مصنفین کی ضد تھا۔ مگر ایسا نہیں تھا بنیادی فرق زاویہ نگاہ کا تھا ترقی پسند حلقے کی نظر میں وہ تحریریں معتبر نہیں تھیں یا اہمیت نہیں رکھتی تھیں جو اشتراکی زاویے کے تحت نہ لکھی گئی ہوں یا ان پر اشتراکی زاویہ حاوی نہ ہو۔ حلقہ ارباب ذوق کی نظر میں وہ تحریریں اچھی تھیں جو ادبی اعتبار سے معیار پر پوری اتریں زاویہ نگاہ چاہے جو بھی ہو۔ اس حلقے کے لکھنے والوں کا خیال تھا۔ اگر تخلیق ادبی معیار پر پوری اترتی ہے تو منفی اور انسان دشمن نہیں ہوگی اور مثبت چیز ہر اعتبار سے ترقی پسند ہوتی ہے۔''
>
> (اس آباد خرابے میں، اختر الایمان، ص:104)

اس سے صد فی صد انکار تو نہیں کیا جا سکتا مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے ادب اور شاعری کو سماجی اصلاح اور زندگی کے بعض دوسرے عوامل کی تبلیغ اور اصلاح کا ذریعہ بنایا وہ ایسا کوئی منشور یا ادبی کلیہ نہیں تھا کہ وہی شاعری ہے جو اس معیار پر پوری اترے۔

مولانا حالی اوران کے رفقا نے ادب کوقوم کی فلاح اور اصلاح کا ذریعہ بنایا اور ادب کے اس پورے سرمایے کوحقارت کی نظر سے دیکھا جس میں تفنن روایتی عشقیہ مضامین اور خارجیت کا غلبہ تھا۔ اس وقت کے حالات اور بطور خاص مسلمانوں کے مسائل اور حالات کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حالی نے اس وقت کی ایک خاص ضرورت کے تحت ادب کوقوم اور سماج کی فلاح اور اصلاح کا ذریعہ سمجھا اور اسے اختیار کیا۔ بعد کے دنوں میں بلکہ ان بزرگوں کی حیات ہی میں ایک ایسا گروہ بھی اٹھا جو ایسے ادب کا مبلغ تھا، جس میں جذبے اور شوق کو مرکزیت حاصل رہی۔ اس وقت بھی حالات ایک غیر یقینی صورت حال کے حامل تھے۔ ملک اور ملک سے باہر سیاسی اور سماجی دونوں سطح پر بے اطمینانی اور شکست وریخت کی کیفیت تھی۔ ملک میں آزادی کی تحریک چل رہی تھی اور باہر کی دنیا دو عالمی جنگوں کے نتیجے میں ہونے والی تباہی سے دو چار تھی۔

اس طرح کے حالات اور مسائل میں بالعموم وقتی اور عارضی مسائل بنیادی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور ترجیحی طور پر اصل مسئلہ پس پشت چلا جاتا ہے۔ اس روشنی میں اگر دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وقتی ضرورت کی تکمیل کے لیے حالات اور سیاسی ہنگاموں کو موضوع سخن بنایا گیا۔ مگر جیسے جیسے حالات بدلتے ہیں اور عارضی دھند چھٹتی ہے تو صحیح صورت حال سامنے آتی ہے اور اس وقت فیصلہ کرنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ آزادی کے فوراً بعد جو شعری تجربے ہوئے ان میں وہ سب بھی تھا جسے ہم عام انسانی سروکار سے تعبیر کر سکتے ہیں اور شعری وفنی ہنرمندی کے نشانات بھی ان میں موجود تھے۔

بانی کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت فن کے دیگر لوازم کے ساتھ ساتھ ایک ایسی کائنات سے بھی واسطہ پڑتا ہے جس میں سماج کے سارے چہرے اور کردار اپنی اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ البتہ اس شاعری میں رشتوں کی گرم جوشی یا ہجر و وصال کے وہ عام قصے نہیں ملتے، جو ہمارے بیشتر شعرا کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ بلکہ یہاں رشتوں کی شکست ہی متکلم کا امتیاز ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بانی ٹوٹتے رشتوں کا شاعر ہے۔ زندگی کی سفاک حقیقتوں یا انسانی زندگی کے المیے کو مختلف جہتوں، شکلوں اور شعری تجربوں میں جگہ دی گئی اس سے ایسا بھی ہوا

کہ زندگی کی وہ بھیانک اور خوفناک شکل بھی سامنے آئی کہ زندگی سے نفرت اور انسانی وجود سے بیزاری پیدا ہونے لگی۔ مگر بانی کے یہاں اس طرح کے معاملات کم ہیں اپنے مخصوص اسلوب اور ڈکشن کے سبب وہ حقیقت کی عکاسی تو کرتے ہیں مگر ایک خاص اہتمام کے ساتھ، بیزاری اور نفرت کو جگہ نہیں دیتے شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار کو پڑھ کر زندگی کی حقیقتوں کا علم ہوتا ہے اور حوصلہ بھی ملتا ہے۔ اس طرح کے اشعار میں کہیں واضح اور کہیں زیریں سطح پر محبت کی ایک لہریں بھی کارفرما دکھائی دیتی ہے، جو انسانیت کے جذبے کو مہمیز کرتی ہے اور رشتوں کے شکست و ریخت پر مایوسی یا بے زاری کے بجائے امکانات کے لامتناہی سلسلے کی کلید فراہم کرتی ہے۔ کمار پاشی کا خیال ہے:

> ''بانی کے یہاں انسان کے باہمی رشتوں کے آغاز کی ہماہمی نہیں بلکہ قطع تعلق کے بعد کی بعض نازک اور غیر عموی کیفیتوں کا بڑا ہی موثر اظہار ملتا ہے۔''

(حرف معتبر، ص:13)

واضح رہے کہ یہ سارا عمل لفظوں کے ایک وسیلے سے ہوتا ہے جن کی تعبیر اور تشریح بظاہر عام اور سادہ ہے مگر اس کے اندر معنی کی اور بھی جہتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔

پھر نہ گنجائش یک صدمہ بھی ہم تم میں رہی
ٹوٹنا سلسلہ دونوں پہ عیاں تھا کتنا

اگر ہمارے درمیاں سے اب ہوا گزر گئی
تو پھر یہی رفاقتیں بحال کر نہ پاؤ گے

میں خلاؤں میں اڑتا ورق تیرے اقرار کا ہوں
نقش جس پر ترے بوسۂ اولیں کا نشاں ہے

وہ ٹوٹتے ہوئے رشتوں کا حسن آخر تھا
کہ چپ سی لگ گئی دونوں کو بات کرتے ہوئے

کہیں نہ آخری جھونکا ہو مٹتے رشتوں کا
یہ درمیاں سے نکلتا ہوا سا کچھ تو ہے

ان اشعار کا واضح بیان رشتوں کی شکست ہے۔ لیکن ان میں دکھ یا صدمے کی اس عام کیفیت کا اظہار نہیں ہے جو بالعموم شعری تجربوں کا حصہ رہی ہے۔ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ رشتوں کے ٹوٹنے بکھرنے کا عمل عشق ومحبت کے جذبوں سے عاری ہے بلکہ ایک عام انسانی کیفیت کا اظہار ہے۔ پہلے شعر میں ایسا لگتا ہے کہ وہ خود اس عمل کا ایک حصہ ہے۔ اور اسے خبر تھی کہ یہ حادثہ ہو کر رہے گا مگر اس کے باوجود کسی صدمے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ایک منزل کے بعد یہ مرحلہ آنا ہی تھا اور دونوں اس سے واقف تھے۔ یعنی رشتوں کی ایک ایسی شکست جو باہمی رضامندی کا نتیجہ ہے۔ 'ٹوٹتا سلسلہ' سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ عمل راتوں رات نہیں ہوا بلکہ یہ طویل مدتوں کا سلسلہ ہے۔ اس سے یہ پہلو بھی نکلتا ہے کہ پہلے جذباتی وفور اور جذب وشوق کا ایک مرحلہ آیا ہوگا اور پھر رفتہ رفتہ سلسلہ ٹوٹا مگر ابتدا کے بجائے انتہا کا بیان کیا گیا اور باور یہ کرایا گیا کہ یہی اصل ہے۔ دوسرے شعر میں 'ہوا گزرنا' کا استعمال توجہ طلب ہے۔ متکلم براہ راست کوئی بات نہیں کہہ رہا ہے لیکن ہوا کے استعارے نے معنویت کے امکان کو بے حد وسیع کر دیا ہے جیسا کہ میر نے اپنے ایک مشہور شعر میں 'قول وقسم' کے ذریعہ کیا ہے۔

ساعد سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لاکر چھوڑ دیے
بھولے اس کے قول وقسم پر ہائے خیال خام کیا

تیسرے شعر میں انسانی رشتے کے ایک غیر معمولی عنصر کی طرف اشارہ ہے۔ ربط وتعلق کی ایک کہانی کہ وہ خواہ کہیں بھی ہو اس کا محور ومرکز زمین ہے۔ خلا اپنی بے پناہ وسعتوں کے باوجود ربط وتعلق کی اس نعمت سے محروم ہے، جو زمین کو حاصل ہے۔ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ خلا میں اڑنے والی مرئی یا غیر مرئی کوئی بھی چیز ہو اس کو واپس زمین کی طرف ہی آنا ہے کیونکہ اس کے ربط کی نشانی یا اس کا تعلق وہ چاہے جس صورت میں ہو زمین پر ہی ملے گی۔

چوتھا شعر تاثر اور کیفیت کے اعتبار سے بھی بلند ہے اور معنی کے لحاظ سے بھی وسیع امکانات کا حامل۔ یہ شعر ایک منطقی انجام کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔

'حسن آخر' رشتوں کا حسن آخر بانی کے یہاں شکست سے عبارت ہے۔ دوسرا مصرعہ قول محال

کی صورت حال کا غماز ہے کہ "چپ سی لگ گئی دونوں کو بات کرتے ہوئے" شعر کا پہلا لفظ 'ٹوٹنے' اشارہ ہے اچانک عمل کے بجائے ایک جاری عمل کا اور دوسرے مصرعے میں اسی لحاظ سے "چپ سی لگ گئی دونوں کو بات کرتے ہوئے" یعنی رشتوں کا ٹوٹنا فی الفور عمل کا نتیجہ نہیں مگر معاً یہ بھی خیال آتا ہے کہ بات کرتے کرتے چپ ہونا تو اچانک ہی ہوتا ہے۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو اس شعر میں ایک عجیب وغریب ڈرامائی صورت حال کا بیان ہے جسے خالص تجرباتی یا غیر معمولی مشاہدے کا شعر کہا جاسکتا ہے۔

آخری شعر بے یقینی کی صورت حال کا غماز ہے۔ اندیشہ تو مٹتے رشتوں کو ظاہر کر رہا ہے مگر انداز استفہامیہ ہے۔ البتہ دوسرے مصرعے میں جو اشارہ ہے وہ بہت واضح اور صاف نہیں ہے یہاں ردیف 'ہوا سا کچھ تو ہے' اہم کام کر رہی ہے۔ یہاں اندیشے کو یقین یا اندیشے کو صرف اندیشے تک ہی محدود کر کے دیکھا جاسکتا ہے۔ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مٹتے رشتوں کا یہ آخری جھونکا ضرور ہے مگر اس کے باوجود اسے آخری نہیں کہا جاسکتا کیونکہ پہلا مصرعہ اگر یقین کرلیا جائے تو دوسرا مصرعہ اس یقین کو پوری طرح استحکام عطا نہیں کرتا بلکہ مٹتے رشتوں کے اندیشے کو بہت ہلکی سی تقویت فراہم کرتا ہے۔ اس طور سے یہ شعر ابتدا اور انتہا کے درمیان کا ہے، جہاں رشتوں کی پوری طرح شکست نہیں ہوئی ہے۔

بانی کے یہاں رشتوں کے بیان کی ایک دوسری جہت بھی ہے۔ اب تک جو اشعار پیش کیے گئے ہیں ان کے مقابلے میں دوسری جہت کے اشعار بہت واضح اور کھلے ہوئے ہیں۔ یہاں ایک ایسے معاشرے کی تصویر کشی ہے، جو خلوص اور انسانی ہمدردی کی نعمتوں سے محروم ہے۔ اشعار کے مطالعہ سے محسوس کیا جاسکتا ہے کہ معاشرے کی عمومی صورت حال تہذیبی قدروں کی پامالی کا پتہ دیتی ہے۔

میں چپ کھڑا تھا تعلق میں اختصار جو تھا
اسی نے بات بنائی وہ ہوشیار جو تھا
محبتیں نہ رہیں اس کے دل میں میرے لیے
مگر وہ ملتا تھا ہنس کر کہ وضع دار جو تھا

آج کیا ٹوٹتے لمحات میسر آئے
یاد تم اپنی عنایات سے بڑھ کر آئے
یہ انا کیسی درمیاں آئی
ہو چلی بزمِ دوستاں خالی
ہمارے دوست بننے کو ضرورت حادثوں کی تھی
عجب اک مرحلہ سا درمیاں میں ابتدا کا تھا
انداز گفتگو تو بڑے پر تپاک تھے
اندر سے قربِ سرد سے دونوں ہلاک تھے
کب سے بھٹکتے ہیں باہم الگ
لحۂ کم مہرباں اور میں

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ان اشعار کی بنیادی خصوصیت ان کی وضاحت ہے اور ساتھ ہی ایک عمومی بیان ان مسائل یا حالات کے تئیں جو روزمرہ کی زندگی میں پیش آتے ہیں۔ ابتدائی دو شعر ایک ہی سلسلے کے ہیں یہاں متکلم ایک ایسے کردار کو پیش کر رہا ہے جو بظاہر ٹھیک ٹھاک ہے مگر اس کا اصل جوہر (خوبی/خرابی) سامنے نہیں آتا بلکہ وہ رشتوں کو اس طرح نبھانے کی کوشش کر رہا ہے کہ بظاہر وہ انتہائی مخلص ہے لیکن ظاہر اور باطن میں کوئی گہری مطابقت نہیں ہے۔ در اصل ہوشیاری، خود غرضی یا مفاد پرستی کا اشارہ ملتا ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں لفظ وضعدار ہے۔ یہ بھی ظاہری رکھ رکھاؤ کا غماز ہے۔ دوسرے شعر میں ایک امکان یہ بھی ہے کہ گرچہ اس کے دل میں محبت نہیں ہے مگر وہ اپنے تئیں اس کو نبھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

تیسرا شعر متکلم کی خوش فہمی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے اور اس ماضی سے بھی جس کی یاد ہمیشہ خوش گوار ہوتی ہے۔ ٹوٹتے لمحات کے سبب بھی یادوں کا سلسلہ ہے اور وہ بھی کچھ یوں کہ یاد آنے والا (محبوب) اپنی مہربانیوں اور نوازشوں سے (جو اکثر صورتوں میں کم ہی ہوتی ہے) کچھ زیادہ ہی یاد آرہا ہے۔ اگلے شعر میں بزم دوستاں کے خالی ہونے کا سبب متکلم انا کو قرار دے رہا ہے۔ اشارہ یہی ہے کہ ربط و تعلق کی کوئی بھی محفل اگر خلوص اور وفا کے بغیر استوار ہوگی تو اس میں انا

ضرور حائل ہوگی، جو تمام تعلقات کو ختم کرنے کا سبب بن سکتی ہے اس کا اطلاق انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کے تعلقات پر کیا جاسکتا ہے۔ اگلا شعر کسی ناگہانی صورت حال کی طرف اشارہ کررہا ہے بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ کوشش کے باجود تعلقات استوار نہیں ہوتے مگر کبھی کبھی کوئی حادثہ اس کی ابتدا کا سبب بن جاتا ہے۔ یہاں ایک طرح کی ڈرامائی کیفیت ہے کہ اصل مرحلہ ابتدا کا ہے اور اس کے لیے کوئی حادثہ درکار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بانی نے اپنے ایک شعر میں اسی مضمون کی توسیع کی ہے۔

نہیں عجب اسی پل کا ہو منتظر وہ بھی
کہ چھولے اس کے بدن کو ذرا سی ہمت کر

ابتدا میں جن دو اشعار کو نقل کیا گیا تھا چھٹا شعر بھی اسی موضوع پر مبنی ہے۔ یہاں بھی مسئلہ ظاہر و باطن کا ہے۔ بظاہر جذبے اور شوق کی گرمی ہے مگر باطن اس طرح کی کسی بھی کیفیت سے عاری ہے۔ آخری شعر میں زمانے سے ایک طرح کی شکایت ہے اور وہ یہ کہ ہم تو ملنا چاہتے ہیں لیکن ہمارے حالات پر لمحہ (وقت) مہربانی نہیں کررہا ہے۔

ان اشعار کی روشنی میں انسانی ربط و تعلق کے آفاقی تصور پر بانی کے تخلیقی سروکار کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اس باب کے ابتدا میں جو خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ بانی ٹوٹتے رشتوں کا شاعر ہے ان اشعار کے مطالعہ سے اس کی بڑی حد تک تصدیق ہوتی ہے۔ البتہ رشتوں کے ربط و تعلق کی ان دو جہات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نئے غزل گویوں (جدیدیت کے زیر اثر غزل کہنے والوں) کے یہاں ایسا کوئی سخت قاعدہ نہیں تھا کہ وہ محض داخلی شاعری کے پابند ہیں یا ہوں گے۔ فن اور اس کے تمام لوازمات کو برتنے اور بروئے کار لانے کا جو عہد اس وقت کے شعرا نے کیا تھا اس کو اپنے تخلیقی تجربوں سے پورا کیا ان شعرا میں بانی ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

بانی کی شعری انفرادیت

مرزا غالب کا یہ دعویٰ کہ ان کا انداز بیان اوروں سے بہت مختلف ہے ''کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور'' شاعرانہ تعلّی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ بانی نے اپنے آخری مجموعہ کلام میں خود کو ''نئے انوکھے موڑ بدلنے والا'' کہا ہے۔ اب تک بانی کا جو مطالعہ پیش کیا گیا ہے اس سے انداز لگایا جا سکتا ہے کہ بانی کی شاعری میں کئی جہتیں ہیں اور خود کو نئے انوکھے موڑ بدلنے والا کہنا ان کا بھی غلط نہیں۔ موضوع اور انداز بیان دونوں سطحوں پر ہمیں ندرت اور نئے پن کا ایک خوش گوار احساس ہوتا ہے اور جب جب بانی کے اشعار کی قرآت ہوتی ہے یہ احساس برقرار رہتا ہے۔

غور طلب پہلو یہ ہے کہ ہمارے وہ شعرا جو اردو شعر و ادب کے مراکز کا حصہ نہیں تھے بلکہ ان کی مادری زبان بھی اردو نہیں تھی، عموماً ان کے یہاں انفرادیت کا رنگ بہت جلد نظر آ جاتا ہے۔ اسے ہم روایت سے بغاوت اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ وہ روایت میں تھے ہی نہیں، جو ہمارے لیے زنجیر پا ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اسے بغاوت سے الگ کیا نام دیں یا اس کی کیا تعبیر کریں ابھی غالباً یہ بھی ممکن نہیں۔ علامہ اقبال، فیض احمد فیض، ظفر اقبال، محمد علوی اور بانی نے اردو گہواروں میں جنم نہیں لیا تھا لیکن ان شعرا کا مطالعہ یہ ضرور واضح کرتا ہے کہ انھیں ہماری ادبی و شعری روایت کا گہرا علم تھا، اس روایت کو انھوں نے پڑھا اور اس میں گلے گلے تک اترے اور پھر اسے بھلا دیا مگر اسی کے بطن سے اپنے لیے وہ راہ نکالی جس پر ان کی شناخت ممکن ہو سکی۔ بانی نے ایک جگہ کہا ہے۔

اڑ چلا وہ اک جدا خاکہ لیے سر میں اکیلا
صبح کا پہلا پرندہ آسماں بھر میں اکیلا

جدا خاکہ لے جانے والا تنہا ہے کوئی اس کا ہمراہی نہیں۔ پرندے کی علامت بانی کے یہاں بہت ہے۔ پرندے کی علامت یہاں انفرادیت سے بھی مملو ہے کیونکہ خاکے سے لے کر آسمان تک ہر جگہ وہ اکیلا ہے۔

اوپر بانی کی جس ندرت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے گزشتہ صفحات کے مطالعہ سے بھی اس کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ بانی کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ اظہار کے لیے لفظوں کو نہایت سلیقے سے استعمال کرتے ہیں غیر ضروری اور فضول الفاظ ان کی شاعری میں بہت کم ہیں۔ غزل کی اصطلاح میں حشو کا عیب ان کے یہاں بہت کم ہے لفظوں کے استعمال کے معاملے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بانی ایک سلیقہ مند شاعر ہیں۔ پروفیسر عتیق اللہ کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ:

> ''بانی کی غزل کا بیرونی کردار حشو وزوائد اور رطب و یابس سے پاک اور غیر ضروری لوازمات سے مبرا ہوتا ہے۔ وہ ایک ایک لفظ کا استعمال بڑے انہماک اور مرکزیت کے ساتھ کرتے ہیں مگر اس طور پر کہ ان کی تخلیقی حسیت اپنی جگہ قائم رہے۔ اس لیے ان کی غزل کا بیرونی ڈھانچہ بڑا تراشیدہ، ضابطہ بند اور اس حد تک مربوط و مضبوط ہوتا ہے کہ اس کی لفظیات کے ترکیبی نظام اور تشکیلی وضع کا متبادل ائتلاف یا کوئی دوسری بدلی ہوئی شکل ناممکن سی نظر آتی ہے۔''

(حساب رنگ، ص:8-9)

بانی کی یہی خصوصیت دراصل انھیں اپنے معاصرین میں اسلوب اور لہجے کی سطح پر ممتاز کرتی ہے۔

اپنی خوش تقدیری جانو اب جو راہیں سہل ہوئیں
ہم بھی ادھر ہی سے گزرے تھے حال ہمارا دیکھو تم

مجھے خبر ہے کہ رستہ مزار چاہتا ہے
میں خستہ پا سہی لیکن نہیں ٹھہرنے کا
جسم اور اک نیم پوشیدہ ہوس آمادگی
آنکھ اور سیر لباس مختصر کرتی ہوئی
اندر اندر یک بیک اٹھے گا طوفان نفی
سب نشاط نفع سب رنج ضرر لے جائے گا
اے ساعت اول کے ضیا بار فرشتے
رنگوں کی سواری کے نکلنے کی خبر دے
شفق شجر موسموں کے زیور نئے نئے سے
دعاؤں کی اوس چنتے منظر نئے نئے سے
میں کسی لمحۂ بے وقت کا اک سایہ تھا
یا کسی حرف تہی اسم کا اظہار تھا میں
میں ڈرر ہا ہوں ہوا میں کہیں بکھر ہی جائے
یہ پھول پھول سا لمحہ تری نشانی کا

ان اشعار کے مطالعہ کے دوران ہمارا پہلا واسطہ جن لفظیات اور تراکیب سے پڑتا ہے وہ اسی ذیل میں آتی ہیں، جن کا اظہار پروفیسر عتیق اللہ نے درج بالا اقتباس میں کیا ہے۔ خوش تقدیری، رستہ کا مزار چاہنا، نیم پوشیدہ ہوس آمادگی، طوفان نفی، نشاط نفع، ساعت اول کے ضیا بار فرشتے، شفق شجر، دعاؤں کی اوس چننا، لمحۂ بے وقت کا سایہ، حرف تہی اسم کا اظہار اور پھول سا لمحہ جیسی لفظیات ندرت اور لفظوں کی تازہ کاری کی غماز ہیں۔ مضامین کی سطح پر بھی ان اشعار میں ندرت اور نیا پن ہے۔ پہلے شعر کا حسن خوش تقدیری کی ترکیب میں پوشیدہ ہے۔ ان اشعار میں بیان ہونے والے مضامین پر اگر غور کیا جائے تو روایتی شاعری کے حصار سے الگ ہمیں نئے ذہن کا اندازہ ہوتا ہے ایسا ذہن جو چیزوں کو من وعن قبول کرنے کے بجائے اس میں کچھ گھٹانے بڑھانے کا قائل ہے۔ ظفر اقبال کے بقول ۔

یہی پیرایۂ اظہار ہے جو آخر کار
اپنے جادو سے پرانے کو نیا کرتا ہے

بانی کے اکثر ناقدین نے لفظوں کے استعمال کے معاملے میں بانی کی سلیقہ مندی کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ درج بالا اشعار کے مطالعہ سے اس بات کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔ ترکیب سازی کے علاوہ بانی کے یہاں نئے نئے پیکر کثرت سے ملتے ہیں۔ یہاں دوسرا اور تیسرا شعر بصری پیکر کا حامل ہے چوتھے اور پانچویں شعر میں حرکی اور سمعی پیکر ہے چھٹا شعر بصری پیکر کا حاصل ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس کو بے مثال شعر قرار دیا ہے۔ اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

> پہلے مصرعے میں 'شفق شجر' موسم جو نئے نئے زیور پہنے ہوئے ہیں، بظاہر زندگی کی علامت ہیں۔ لیکن شفق چاہے وہ صبح کی ہو چاہے شام کی، رات کی یا دن کی موت کا بھی اشارہ ہے۔ موسموں کے زیور نئے نئے سے ہیں، یعنی پرانے ہیں لیکن نئے نئے سے لگ رہے ہیں 'شفق شجر' اور 'شجر' کو الگ الگ بھی پڑھ سکتے ہیں، یعنی شفق، شجر اور موسم، ان تینوں کے زیور نئے نئے سے ہیں، 'شفق شجر' کو ایک ترکیب فرض کریں تو ایک صورت یہ بنتی ہے کہ موسم اپنی سرخی اور شادابی میں شفق کے شجر کی طرح ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ 'شفق' کی صفت 'شجر' فرض کی جائے، یعنی نہ صرف یہ کہ 'شجر' مثال شفق پھول رہے ہیں (شفق پھولنا محاورہ ہے) بلکہ یہ بھی کہ 'شفق' مثال شجر بلند و بالا اور توانا ہے لیکن یہ سارا منظر دوسرے مصرعے میں ایک اور جہت کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ نئے نئے زیوروں کے باوجود 'دعاؤں کی اوس' بھی منظروں پر ہے۔ 'اوس' اگر شادابی کا استعارہ ہے تو موت کی ٹھنڈک کا بھی (امیدوں پر اوس پڑ جانا بھی محاورہ ہے) منظروں کی دعا کو اوس چنتے ہوئے دیکھنا اگر ایک طرف اس بات کا اشارہ ہے کہ وہ دل جنھیں دعا کرنے کی بھی تاب نہ تھی، اب کم سے کم دعا کرنے تو لگے ہیں (خاموشی

سے اظہار کی طرف گزران) تو دوسری طرف اس بات کا بھی اشارہ ہے کہ عمل
کی دھوپ کے بجائے دعا کی ٹھنڈک ہی ہاتھ لگی ہے۔ ذومعنی اشاروں کے
باعث شعر میں بے مثال خوب صورتی پیدا ہوگئی ہے۔"
(شفق شجر، ص:46)

فاروقی کی اس تشریح سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بانی کے تخلیقی رویوں میں کتنا رچاؤ اور فن کے لیے کتنا ریاض تھا۔ یادگار غالب میں مولانا حالی نے لکھا ہے:

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شاعر اور اس کے کلام کے رتبے کا اندازہ اس
کے کلام کی قلت اور کثرت سے نہیں ہوتا، بلکہ اس بات سے ہوتا ہے کہ
اس کے منتخب اور برگزیدہ اشعار کس درجے کے ہیں۔"

(یادگار غالب، مولانا الطاف حسین حالی، ص:132)

حالی کا یہ خیال بالکل درست ہے اور بڑی حد تک اس زمرے میں بانی کا کلام بھی آجاتا ہے۔ بانی نے بعض مشکل زمینوں میں ایسے شعر کہے ہیں جو یقیناً انتخاب کہے جاسکتے ہیں۔ البتہ بانی کا یہ شعری تجربہ سیماب اکبرآبادی اور آرزو لکھنوی کی طرح نئی نئی زمینوں میں صرف تجربہ کرنے جیسا نہیں ہے بلکہ اس تجربے کا حاصل بھی ہے اس ضمن میں کچھ اشعار دیکھیں۔

سیر شب لامکاں اور میں
ایک ہوئے رفتگاں اور میں
سانس خلاؤں نے لی سینہ بھر
پھیل گیا آسماں اور میں
خاک و خلا بے چراغ اور شب
نقش و نوا بے نشاں اور میں
کب سے بھٹکتے ہیں باہم الگ
لحۂ کم مہرباں اور میں

خود چاک باطن خبر ایک لمحہ
عالم بہ عالم سفر ایک لمحہ
مسمار آنکھ اور خس ڈھیر منظر
غارت طبق طاق و در ایک لمحہ
پہلے خلاؤں میں دیکھا کیے ہم
ڈھونڈا کیے ہم دگر ایک لمحہ
کیا کیا بساطیں الٹتا گیا ہے
لمحات سے ٹوٹ کر ایک لمحہ

اس غزل کے سارے ہی شعر منتخب ہیں۔

بانی نے حرف معتبر میں لکھا ہے :

میں چاہتا تو یہی تھا کہ جب تک کچھ کہنے کے قابل نہ کہہ لوں مجموعہ اشاعت کے لیے گھر باہر نہ کروں۔

(حرف معتبر، ص:20)

اپنے اولین مجموعہ میں بانی نے جس خواہش کا اظہار کیا تھا شفق شجر تک آتے آتے وہ بہت کچھ کہنے کے قابل ہو گئے تھے۔ بانی کے اکثر نقادوں نے 'حرف معتبر' کے بجائے 'حساب رنگ' اور اس کے بعد والی شاعری کو زیادہ معتبر قرار دیا ہے۔ لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ 'حساب رنگ' کا مرحلہ 'حرف معتبر' کے بعد ہی آیا۔ 'شفق شجر' اور 'حساب رنگ' کو اعتبار 'حرف معتبر' سے ہی ملا مگر یہ کلیہ ان لوگوں نے بانی کی اپنی شاعری کو سامنے رکھ کر ترتیب دیا ہے دوسرے شعرا کے مقابلے نہیں۔ حرف معتبر میں بانی نے خود کہا ہے ۔

بولتی تصویر میں اک نقش لیکن کچھ ہٹا سا
ایک حرف معتبر لفظوں کے لشکر میں اکیلا

نقش لیکن کچھ ہٹا سا بعینہ لفظوں کے لشکر میں جس طرح معتبر حرف اکیلا ہوتا ہے۔ اپنے الگ

ہونے کا جو مدھم احساس 'حرف معتبر' میں تھا 'شفق شجر' میں یہ واضح اور دوٹوک ہو گیا۔

چلی ڈگر پر کبھی نہ چلنے والا میں
نئے انوکھے موڑ بدلنے والا میں

بانی کو اپنے منفرد ہونے اور عام فن کاروں سے الگ شعری اسلوب اختیار کرنے کا واضح احساس تھا اس کی تصدیق مذکورہ بالا اشعار کے ساتھ ساتھ ان کے شعری رویے سے بھی ہوتی ہے۔ 'نئے اور انوکھے' کا احساس صرف بانی کو ہی نہیں دوسروں کو بھی تھا۔ عمیق حنفی نے تین دہائی قبل بانی کے بارے میں جو باتیں کہی تھیں وہ آج بھی صحیح ہیں:

> ''بانی کی شاعری ہندستان میں جدید تر غزل کی سب سے زیادہ قوی اور وسیع احساسات والی تصویروں کا البم ہے، کل یہ ان لوگوں کے لیے گراں قدر ثابت ہوگی جو تو غزل کی زندہ روایت اور تجدیدات کی دستاویز تلاش کریں گے۔''

(بانی ایک مطالعہ: محمود ہاشمی، سہ ماہی غبار خاطر 4، اورنگ آباد 1976، ص 113)

بانی کے اسلوب کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے روایتی اقدار کی شکست و ریخت کے لا متناہی غم کو اپنے لہجے سے ہم آہنگ کر کے میر کی سنجیدگی اور غالب کی فکری صلابت کے خمیر سے کیفیت کو نئے پیکروں کے ذریعے مجسم کیا۔ بانی کا شعری آہنگ ٹھہرا ہوا اور وقفے دار ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے غم اور فکر میں ڈوبا ہوا شخص اپنے مخاطب سے گفتگو کے دوران آسمان پر نظر جمائے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں رک رک کر کائنات کے رموز و نکات بیان کر رہا ہے ایسی صورت میں بانی کا لہجہ خود کلامی یعنی پہلی آواز اور تیسری آواز کے ارتباط سے متشکل ہوتا ہے۔ وہ زمینی مسائل کا عکس زمین سے ماورا آئینے میں ملاحظہ کرتے ہیں، مشاہدے کی وڑا کی زبان کی تنگی کی شاکی ہے۔ روشن معنی نئے الفاظ وتراکیب میں ملفوف ہو کر ایک ایسی اجنبیت پیدا کرتے ہیں جو متاثر کن ہے۔ بانی اپنے ہم عصروں میں بامعنی اجنبیت پیدا کرنے کے ہنر سے واقف ہی نہیں بلکہ اس معاملے میں بعض اعتبار سے زیب غوری سے بھی آگے ہیں۔ بانی کے کلام کی پر اسرار فضا ان کی شعری انفرادیت کی ضامن ہے۔

ظفر اقبال کے یہاں تضادوں کی مثبت منطق کارفرما ہے ان کی اجنبیت سے قاری و سامع کو ایک نئی جہت کا احساس ہوتا ہے، جو ایک خوش گواری کا باعث ہے جبکہ بانی کے یہاں تضادات کی پراسراریت ہے، جس کے سبب قاری خلاؤں میں گھوم کر اپنے باطن کے نہاں خانوں میں اتر جاتا ہے اور ایک بے وجہ خاموشی سے ہم کنار ہو کر ہمدردانہ جذبے سے مملو ہو جاتا ہے، جو اس کے لیے باعث تسکین ہوتا ہے۔ کہیں کہیں بانی کی غزل دیومالائی پس منظر سے ابھرتی ہے جو معنی کی سائنسی منطق کو پاش پاش کر کے لاشعور کی دبی کچلی خواہشوں کو بیدار کرتی ہے۔ یہ باعث نجات بھی ہے اور معکوسی ترقی کا سبب بھی۔

بانی کی نثر

بانی کی عام پہچان ان کی شاعری ہے مگر نثر اور ادبی صحافت سے بھی ان کا تعلق رہا ہے۔ کئی اردو رسائل سے ان کی وابستگی رہی۔ نیز انھوں نے اپنے بعض معاصرین کے بارے میں مضامین بھی لکھے۔ دہلی میں اردو کی ادبی صحافت کی تاریخ میں بانی کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ مخمور سعیدی نے اپنے ایک مضمون 'دہلی میں اردو کی ادبی صحافت: آزادی کے بعد' میں لکھا ہے کہ 1953 میں گوپال متل نے جب 'تحریک' کا دہلی سے اجرا کیا تو اس کے ادارۂ تحریر میں بانی بھی شامل تھا۔ انھوں نے لکھا:

> ''ادارۂ تحریر میں ان کے علاوہ کرشن اثر، وشوا ناتھ درد، من موہن تلخ اور راجیند ر دیپک کے نام تھے جو تازہ واردان بساط ادب میں تھے۔ راجیند ر دیپک آگے چل کر بانی کے نام سے مشہور ہوئے۔''

(اردو صحافت ماضی اور حال، مرتبہ پروفیسر خالد محمود، ڈاکٹر سرورالہدیٰ ص: 58)

اسی مضمون میں ایک اور جگہ مخمور سعیدی نے لکھا ہے کہ دت بھارتی نے بانی کے تعاون سے ماہنامہ 'تخلیق' کا اجرا کیا:

> دت بھارتی مقبول عام ناول لکھنے کے لیے شہرت رکھتے ہیں۔ انھیں غالباً بانی نے ادبی صحافت میں قدم رکھنے پر آمادہ کیا اور دت صاحب نے انھیں کے تعاون سے ماہنامہ 'تخلیق' کا اجرا کیا۔ اس کی ایک خصوصی اشاعت

مختصر نظم نمبر کی بڑی شہرت ہوئی تھی اس زمانے میں ۔نمبر بانی کا مرتب کردہ تھا۔

(حوالہ ایضاً ص:60)

برسوں کی تلاش وجستجو کے باوجود اب تک یہ نمبر دستیاب نہیں ہوسکا ہے۔ بانی نے بھی اس نمبر کا ایک جگہ ذکر کیا ہے۔تخلیقی فن کار کی حیثیت سے بانی کے فکر وشعور کا سب کو اندازہ تھا۔البتہ بانی کے مضامین کے مطالعہ سے انداز ہوتا ہے کہ معاملہ صرف غزل تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ وہ نثر میں بھی اظہار کی قوت سے مالا مال تھے۔حسن نعیم ،محسن زیدی اور کرشن موہن پر لکھتے وقت ان کی نگاہ فنی دروبست پر زیادہ ہے اور یہی چیز ان کے نزدیک زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ان مضامین کے مطالعہ سے یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ بانی کو انگریزی ادبیات سے آگاہی تھی۔مغربی شاعروں اور ادیبوں کے فنی امتیازات اور تخلیقی سرگرمیاں ان مضامین میں متعدد بار زیر بحث آئی ہیں۔

فرانس کے مشہور شاعر رمبو کے سوانحی حالات پر بانی کا مضمون بہت معلوماتی ہے۔اس سے بانی کی مغربی شاعروں کے بارے میں معلومات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔یہ مضمون 'ماہ نامہ تحریک' کے جولائی اگست 1958 کے شمارے میں شائع ہوا۔مضمون کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بانی کو انگریزی زبان پر بھی قدرت حاصل تھی۔ورنہ رمبو کے سوانحی حالات جمع کرنا اور اس پر کچھ لکھنا آسان نہیں تھا۔اس مضمون میں صرف رمبو کا تعارف ہی نہیں بلکہ ایک تخلیق کار کے تئیں ان کی گہری دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔بانی کا یہ سوانحی مضمون ڈاکٹر اینی اسٹارکی کے مطالعہ سے ماخوذ ہے۔

جین نکلس آرتھر رمبو 20 اکتوبر 1854 کو فرانس کے شہر' شارلے ول' میں پیدا ہوا۔ بانی نے اس شہر کو نیم خوابیدہ کہا ہے۔مضمون کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ رمبو کی زندگی ناکامیوں اور محرومیوں سے عبارت تھی۔بانی کے بقول جب رمبو چھ سال کا تھا اس کے والد پورے گھر کو خدا کے حوالے کر کے ایسے گئے کہ پھر کبھی واپس نہیں آئے۔رمبو کو ایسا ماحول نہیں ملا جسے ہم تعلیم یا شاعری کے لیے ساز گار کہہ سکیں۔وہ متعدد بار گھر سے بھاگ نکلا کبھی فرانس تو کبھی کہیں اور مگر اس کی تخلیقی حسیت نے شعری شعور کو باقی رکھا۔اس مختصر سے مضمون سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ رمبو اور میراجی میں خاصی مماثلت تھی۔بانی نے لکھا ہے:

اس کے بعد وہ [رمبو] اپنے امیرانہ ٹھاٹھ سے نفرت کرنے لگا۔ وہ اپنے
آپ کو گندہ اور بال بکھرائی ہوئی صورت میں پاکر فخر محسوس کرنے لگا تھا۔
مذہب اور عورت کا دشمن بن گیا وہ!

(تحریک جولائی اگست 1958 ص:50)

رمبو کی شاعری 1870 تا 1873 کی ہے۔ نثری نظموں کے حوالے سے رمبو کو شہرت حاصل ہے۔ پندرہ برس کی عمر سے ہی شعر گوئی کا آغاز کرنے والا رمبو اپنے استاد از مبارڈ سے بہت متاثر تھا۔ رمبو کے ذوق ادب کو انہی سے تقویت ملی۔

ہم عصر شاعروں میں بودلیئر اور پال ورلین سے رمبو کے مراسم تھے۔ خصوصاً پال ورلین سے قریبی مراسم تھے، دونوں کی ملاقاتیں بھی رہیں۔ رمبو نے اپنی کچھ نظمیں بھی ورلین کو بھیجی تھیں۔ مضمون کی آخری سطروں سے رمبو کے آخری ایام اور پال ورلین سے تعلق کا مزید اندازہ کیا جا سکتا ہے:

رمبو کچھ عرصہ روزگار کے سلسلے میں یورپ کے مختلف مقامات پر گھومنے کے بعد ابی سینیا میں بطور تاجر مقیم ہو گیا۔ اس نے اپنے آپ کو ادبی دنیا سے بالکل بیگانہ کر لیا اور دوستوں کے خطوط کا جواب دینا بھی اب بند کر دیا۔ اسی ویرلین نے اب رمبو کو خاک شدہ جان کر اس کی نظموں کا مجموعہ 1886 میں شائع کیا۔ مگر رمبو بطور شاعر اپنی ہستی سے بالکل فراموش تھا اور زیادہ سے زیادہ محنت کر کے بڑھاپے کے لیے رقم جمع کر رہا تھا۔ 1891 میں اس کی بچپن میں جلی ہوئی ٹانگ نے اسے تکلیف دینا شروع کیا۔ روگ بڑھتا گیا۔ وہ واپس فرانس پہنچا۔ وہاں اس کی دائیں ٹانگ کاٹ دی گئی اور آخر کار وہ پھر اپنی ماں کے پاس آ گیا۔ مگر اس کی طبیعت نڈھال ہو گئی تھی۔ اس کا جسم بڑھتی ہوئی تکلیفوں کو نہ سہ سکا۔
15 نومبر 1891 کو اس نے 37 برس کی عمر میں وفات پائی۔"

(تحریک جولائی اگست 1958 ص:40)

مختصر ہونے کے باوجود یہ مضمون بہت معلوماتی ہے۔

بانی کی غزلوں میں اسلوب اور اظہار کی شگفتگی کا احساس ہوتا ہے اور انھوں نے نئی نئی لفظیات کو فروغ دیا ہے۔ دوسرے شعرا کے کلام کا مطالعہ بھی وہ اسی روشنی میں کرتے ہیں۔ جن چند شعرا کے فکر وفن پر بانی نے تعارفی مضامین لکھے ہیں، ان میں بانی نے اپنی یہی روش قائم رکھی ہے۔ محسن زیدی کا شمار جدید شعرا میں نہیں کیا جاتا بلکہ وہ ترقی پسند کہے جاتے ہیں۔ ان کے شعری مجموعے 'رشتۂ کلام' پر رائے دیتے ہوئے بانی نے محسن زیدی کی شاعری کے بارے میں کہا تھا کہ ''اس میں طے شدہ تغزل سے گریز ہی محض نہیں بلکہ نئے تعلقات کی تلاش کے تجربہ کا اثباتی پہلو بھی موجود ہے۔'' بانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ محسن زیدی اپنے پہلے مجموعے سے 'رشتۂ کلام' تک کے سفر میں منظر و معنی کے داخلی رشتے کی دریافت میں منہمک رہے۔ بانی نے رشتۂ کلام کے فلیپ پر لکھا ہے:

> ''ان کے [محسن زیدی] پہلے مجموعۂ شعر 'شہر دل' سے نئے مجموعے 'رشتۂ کلام' تک تخلیقی جذبے کا سفر، منظر و معنی کے داخلی رشتے کی دریافت میں منہمک رہا۔ ذات آشنائی سے عصر آشنائی تک ایک کرب انگیز احساس کی بساط ہے، متاع دل کو بچالے جانے کی سعی، دشت جاں کی مسافت اور خود پیکاری محسن کے شعری احساس کی پہچان قائم کرتی ہیں۔ منزل تو محسن کی بھی وہی تکمیل ذات ہے مگر وہ اسے خوابیدگی میں طے نہیں کرتے۔''

نثر میں 'تکمیل ذات کی منزل' اور 'خوابیدگی میں طے نہیں کرتے' جیسے جملے تخلیقی احساس کے حامل کہے جاسکتے ہیں اور یہ اک نوع کی علامتی نثر ہے۔ چند بلیغ جملوں میں محسن زیدی کا شاعرانہ تعارف ہے۔ غور کیجیے ان سطروں کے درمیان سے ترقی پسندی اور جدیدیت کے نظری مباحث جھلکتے نظر آتے ہیں۔

حسن نعیم کی شاعری پر بانی کا مضمون 'نئی غزل کا دانش ور۔ حسن نعیم' حیدرآباد سے نکلنے والے ہفت روزہ اخبار 'برگ آوارہ' میں 16 جولائی 1977 کو شائع ہوا تھا۔ اب یہ مضمون کلیات حسن نعیم میں شامل ہے۔ ڈاکٹر احمد کفیل نے حسن نعیم کے کلام کو یکجا کر کے 'کلیات حسن نعیم' کی صورت دے

دی، جسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے 2006 میں شائع کیا۔ باقی نے اپنے مضمون میں اس شکایت کا اظہار کیا کہ حسن نعیم کی شاعری پر ہمارے نقادوں نے خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ باقی کے بقول 1970 سے پہلے کا دور غزل کے لیے بہت زیادہ سازگار نہیں تھا۔ دوسرے درجے کے نظم نگار اچھے غزل گو یوں سے خود کو برتر سمجھتے تھے۔ اس دور میں نہ صرف غزل معتوب ہوئی بلکہ غزل کہنے والوں کے قدم بھی ڈگمگائے۔ ایسے زمانے میں حسن نعیم نے غزل کے احیا میں اپنا لہو صرف کیا۔ باقی کا یہ مضمون طویل ہے۔ انھوں نے کوشش کی ہے کہ حسن نعیم کے فنی امتیازات سامنے آئیں اور ان کی غزلوں کی نمایاں خصوصیات واضح ہوں۔ باقی نے حسن نعیم کو 'تازہ شعور شاعر' کا نام دیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس سے غزل کی متاع فکر واظہار میں اضافہ ہوا ہے۔ باقی کے بقول حسن نعیم کے یہاں گھن گرج نہیں ہے بلکہ ان کے لہجے میں سبک خرامی کی کیفیت ملتی ہے۔ باقی کے بقول:

> حسن نعیم کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے پہلے دو باتوں کا ذہن نشین کر لینا از حد ضروری ہے۔ اول یہ کہ جدید تر لہجے کی گھن گرج کے مقابلے میں ان کے یہاں فکر کی سبک خرامی، اظہار کی آب دار نرم روی کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ دوم یہ کہ جدید تر نامانوس لفظیات کے جواب میں ان کے یہاں شعری روایات کے گہرے ادراک کا سراغ ملتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کے اشعار میں نئے اظہارات کی کمی ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اپنے شعری مجموعے کی اساس نئی تراکیب سے کہیں زیادہ نئے احساس پر رکھی ہے۔

(کلیات حسن نعیم، مرتب احمد کفیل ص:69)

باقی کے ان چند مضامین کا مطالعہ یہ بھی بتاتا ہے کہ نثر میں بھی وہ شعری اسلوب اور ترکیب سازی کے عمل کو اختیار کرتے ہیں۔ یہ اسلوب ٹھیک تو ہے البتہ کہیں کہیں نامانوسیت کا احساس ہوتا ہے۔ باقی حسن نعیم کے شعری آہنگ، تفکر اور ان کی تخلیق شناسی کی داد دیتے ہیں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ مروج غزلیہ اسلوب سے جس کو اس عہد کے بعض نقاد فروغ دے رہے تھے، حسن نعیم کی سنجیدہ مزاجی کبھی متاثر نہ ہو سکی۔ انھیں اپنے فن اور اپنے اسلوب پر اعتماد تھا اسی لیے وہ اپنی راہ چلتے رہے اور نئی غزل کے باب میں انھیں نمایاں مقام حاصل ہوا۔ اسی ضمن میں باقی نے یہ بھی لکھا ہے:

وہ غزل کی وسعتوں سے اچھی طرح واقف ہیں، انھیں دوسروں کے
دوراز کارانہ اظہارات کبھی مرعوب نہ کر سکے۔ نعیم الفاظ کے تخلیقی استعمال
کے قائل ہیں نہ کہ بیان کی آرائشگی کے، معنی آفرینی ان کو عزیز ہے نہ کہ بے
تہہ تجربے کی چونکا دینے والی کرتب سازی۔

(کلیات حسن نعیم، مرتب احمد کفیل ص:74)

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مضمون حسن نعیم کی شاعری کے بارے میں ان کے ایک معاصر کا واضح اعتراف ہے۔ بانی کے یہاں ادب اور شعر کی جو فہم تھی اس کا پورا اظہار اس مضمون میں ہوا ہے۔ بانی باضابطہ ناقد تو تھے نہیں لیکن اس مضمون میں انھوں نے بعض شعروں کی تفہیم کا فریضہ بھی ادا کیا ہے تا کہ حسن نعیم کی شعری کائنات مزید روشن ہو سکے۔ حسن نعیم کے درج ذیل شعر کی تشریح بانی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں۔

یہ بھی تسلیم کہ تو مجھ سے بچھڑ کر خوش ہے
ترے آنچل کا کوئی تار ہنسا تو ہوگا

آنچل کے تار ہنسنے میں شاعر نے محبوب کی بے وفائی کے عنصر کو سمو دیا ہے کہ
وہی ہنسی محبوب سے شکایت کر رہی ہے کہ اس میں خوشی کی کیا کیفیت ہے۔

(کلیات حسن نعیم، مرتب احمد کفیل ص:73)

بانی نے اسی لیے لکھا ہے کہ حسن نعیم غزل کی رمز کاری کے فن سے خوب واقف ہیں۔ زندگی کے ہر تجربہ کو وہ اپنے ذہن کے گوشے میں جگہ دیتے ہیں۔ بانی رمز کاری کو تفکر کا ایک وسیلہ تسلیم کرتے ہیں اور اسی لیے ان کا خیال ہے کہ نعیم کی غزلوں کا رمز تفکراتی ہے جبکہ مومن کا رمز جذبے کے اشاراتی اسلوب سے وابستہ ہے۔ بانی کے بقول:

مومن کے یہاں رمز نہیں بلکہ جذبے کا اشاراتی اسلوب ملتا ہے۔ تہہ داری
کے مقابلے میں پیچ دار کنایہ دکھائی دیتا ہے۔ میرے نزدیک رمز کاری کا
ہنر تفکر کے وسیلے سے پیدا ہوتا ہے۔ شاعر تفکر کو واضح فلسفہ نہ بنانے کی
غرض سے رمز کاری کا سہارا لیتا ہے جیسا کہ غالب نے کیا۔ نعیم کی

> رمز کاری بڑی حد تک غالب سے متاثر ضرور ہے لیکن نعیم نے غالب سے
> بچ نکلنے کا خوب صورت راستہ بھی تلاش کرلیا۔ وہ یہ کہ بلا واسطہ اظہار کے
> ذریعہ شعری احساس کا رخ تلمیحات کی طرف موڑ دیا۔ اس طرح رمز اور
> تہہ داری پر نعیم کی گرفت مضبوط ہوتی چلی گئی۔

(کلیات حسن نعیم، مرتب احمد کفیل ص:71)

ان سطور کی روشنی میں یہ کہنا بجا ہے کہ باقی سخنور اور سخن فہم دونوں تھا۔ یہ کشادہ قلب فن کار کی دلیل بھی ہے کہ اس نے معاصرانہ چشمک کے بجائے فنی اعتراف کی راہ اختیار کی۔ یقیناً حسن نعیم نے بھی اس مضمون کو ضرور سراہا ہوگا۔

باقی کا ایک اہم مضمون کرشن موہن کی شاعری کے بارے میں شاہراہ دہلی کے اپریل 1959 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ دہلی کے شعری منظرنامے پر کرشن موہن کو مقبولیت حاصل تھی۔ ان کی تخلیقی سرگرمی سے لوگ واقف تھے۔ ان کے ایک درجن سے زائد شعری مجموعے شائع ہوئے۔ کرشن موہن کو عرفان ذات اور تزکیۂ نفس کا شاعر قرار دیا گیا کہ ان کے یہاں جدت اور نئے پن کا عنصر غالب تھا۔ باقی نے کرشن موہن کو اردو شاعری کو گاتھک کیفیت سے روشناس کرانے والا واحد شاعر قرار دیا۔ اس مضمون میں نظموں سے زیادہ مثالیں پیش کی گئی ہیں جبکہ آخر میں غزلوں کا مطالعہ بھی شامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> گاتھک کیفیت، خوفناک اور ماتمی منظر و تصویر کی آغوش میں پرورش پاتی
> ہے اور اس لیے یہ غیر معمولی خصوصیت ہر شاعر کے یہاں کامیابی کے
> ساتھ نہیں پائی جاتی۔ وہی شاعر اس راستے پر ثابت قدمی سے چل سکتا
> ہے، جس کا دماغ جنت کے تصور کی بے پناہ مسرتوں سے سرشار رہتا ہو۔
> دوسرے یہ کہ اس قسم کی کیفیات بعض اوقات علالت کے عالم میں یا خوف
> کو دور کرنے کی غرض سے پیدا کی جاتی ہیں، جہاں گاتھک کیفیت کی بہت
> سی خوبیاں ہیں کہ ہمیں رومانی داخلی ہم آہنگی سے آشنا کرتی ہے وہاں اس

امر کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر شاعر جو گاتھک کیفیت پیدا کرنا چاہتا ہے صحت
مند تصور سے بھٹک بھی سکتا ہے۔

(شاہراہ: اپریل 1959 ص: 17)

بانی کا خیال ہے کہ دل کو دہلا دینے والے صوتی مناظر کرشن موہن کی شاعری میں یکے بعد دیگرے ابھرتے ہیں اور پڑھنے والوں پر جادو کرتے چلے جاتے ہیں۔ بانی نے اس دعوی کی تصدیق کے لیے کرشن موہن کی بعض نظموں (سائے، ہوکا میدان، سانپوں کا ناچ، مرگھٹ، آسیب، زمستاں کی شام، گزرگاہ) کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ بانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ کرشن موہن گاتھک کیفیت میں سرشار ہوکر ایسے موضوعات تلاش کرتا ہے جو بہت کم شاعروں میں پائے جاتے ہیں۔ نیز یہ بھی کہ کرشن موہن کے یہاں موضوعات کی رنگا رنگی بھی ہے۔ کرشن موہن کی شاعری کے بارے میں بانی کا یہ تبصرہ نصف صدی قبل کا ہے۔ آج جب ہم ٹھہر کر غور کرتے ہیں تو کرشن موہن کی شاعری کے وہ امتیازات جو بانی نے دریافت کیے تھے پوری طرح روشن نہیں نظر آتے۔ ایک عرصہ گزر جانے کے بعد ان کی شاعری ایک عام تجربہ ہی قرار پائے گی۔ نئی لفظیات اور چونکا دینے والی لفظیات کا استعمال اس زمانے میں ظفر اقبال اور بعض دوسرے جدید شعرا کر رہے تھے جن میں کرشن موہن کا نام بھی شامل تھا۔

بانی کی ان نثری تحریروں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ صرف شاعری تک محدود نہیں تھے۔ انھوں نے نثر میں بھی جو کچھ لکھا اس سے بھی ان کے ادبی شعور کا گہرا احساس ہوتا ہے۔

بانی کا نایاب کلام

بانی کے انتقال (1981) پر ایک مضمون میں من موہن تلخ نے بانی کے بارے میں لکھا کہ 1958 تک بانی بانی نہ تھا بلکہ راجیندر ردیپک تھا۔'بانی' نامی مضمون میں انھوں نے یہ بھی لکھا کہ:

''بانی کی ادبی زندگی کی شروعات میری آنکھوں کے سامنے، میرے ہی قریب ہوئی تھی۔ بلکہ آج بانی کے ان گنت مداحوں کو یہ بھی بتادوں کہ 1958 میں جب میرا پہلا مجموعہ کلام 'چراغ فکر' شائع ہوا اب تک بانی بانی نہ تھا۔ بلکہ راجیندر ردیپک تھا، میں نہیں کہہ سکتا کہ بانی نے راجیندر ردیپک کی ان غزلوں کا کیا کیا۔ انھیں حرف معتبر میں شامل کیوں نہ کیا۔ آیئے اس کے اس دور کا ایک شعر سنیے۔

مری ہستی کا سناٹا بڑی مشکل سے ٹوٹا ہے
تری آواز سن کر دیر تک حیراں رہا ہوں میں

یہ شعر اور اسی انداز کی دوسری غزلیں نہ حرف معتبر میں ہیں اور نہ حساب رنگ میں۔ ان غزلوں کو اپنے دونوں مجموعوں میں شامل نہ کرنے کا فیصلہ شاید بانی کا اپنا ہی رہا ہوگا۔''

(ماہنامہ آج کل دسمبر 1981)

من موہن تلخ کے سطور بالا کی تصدیق 'حرف معتبر' میں شامل چندر پرکاش شاد کی اس تحریر سے

بھی کی جاسکتی ہے۔ چندر پرکاش شاد نے لکھا ہے کہ:

''جب بانی نے کہا کہ مجموعہ چھاپ رہا ہوں، میرے کلام کا انتخاب کردو... کہنے لگا بہت کڑا انتخاب کرنا ہے اور یہ کام تمھارے ذمے ہے۔ چنانچہ دو چار نشستیں ہوئیں۔ جہاں کہیں میں نے کوئی تجویز پیش کی بانی نے بڑی فراخ دلی سے قبول کی۔''

(حرف معتبر،ص:10)

بانی کی یہ فراخ دلی قابل رشک ہے۔ بانی کی غزلوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے کلام کو مستقل صیقل کرتے رہتے تھے۔ ادبی رسائل میں اشاعت کے بعد بھی غور وفکر کا سلسلہ جاری رہتا۔ ایسی بہت سی غزلیں ہیں جن کے مصرعے یا اشعار بانی نے تبدیل کیے۔ دراصل یہ بانی کا محتاط رویہ تھا۔ اس رویے نے بہت جلد لوگوں کو اپنی طرف متوجہ بھی کیا۔ 'حرف معتبر' کی اشاعت کے بعد رشید حسن خاں نے ماہ نامہ' آج کل' میں اس پر تبصرہ کیا۔ خان صاحب سے اردو والے خوب واقف ہیں۔ زبان وبیان کے معاملے میں وہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے لیکن بانی کے پہلے مجموعۂ کلام' حرف معتبر' پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:

''بیان کی خوبی، خیالوں کا تنوع، اظہار کا نیا پن اور روایت کا مناسب حد تک سایہ فگن رہنا اس مجموعے میں عیاں ہے۔ مجھے توقع ہے کہ اب جب کہ شاعر کا مجموعۂ کلام سامنے آچکا ہے اس کے یہاں حسن بیان، حسن ادا، فکری انفرادیت اور شگفتگی کا رنگ بڑھے گا اور اس حد تک کہ شعری سطح پر جس انفرادیت کا مطالبہ کیا جاتا ہے اس کی واضح تشکیل ہو سکے گی۔''

(آج کل، اپریل1972 ص47 کالم2)

ماہ نامہ تحریک، شاہراہ، شب خون اور دیگر رسائل کی پرانی فائلوں میں موجود بانی کے کلام کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ بانی نے نہ صرف مجموعے کی اشاعت سے قبل خود اپنے کلام کا سخت انتخاب کیا بلکہ کلام پر نظر ثانی بھی کی۔ ماہ نامہ تحریک (جون1958) میں بانی کی مطبوعہ غزل کا مطلع تھا۔

وہ تغافل ہے کہ ایمان وفا پر آئے
یاد تم اپنی عنایات سے بڑھ کر آئے

اسی غزل کا دوسرا شعر ہے۔

یوں تو قصے نہیں کم ہم کو رلانے کے لیے
اک اچٹتا سا تعلق بھی میسر آئے

حرف معتبر (اشاعت:1971) میں اس غزل کے متعدد اشعار کو پہلے سے بہتر کیا گیا ہے۔ موجودہ صورت میں اس غزل کا مطلع بانی کے اچھے شعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جبکہ مطلع کی اولین صورت بہت کمزور تھی۔ مطلع اب اس طرح ہو گیا ہے ۔

آج کیا ٹوٹتے لمحات میسر آئے
یاد تم اپنی عنایات سے بڑھ کر آئے

اسی طرح دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ بھی اب بہتر ہو گیا ہے ع

تیرے قصے نہیں کم یوں تو رلانے کے لیے

'تحریک' میں اس غزل کے اشعار کی تعداد دس تھی جبکہ مجموعۂ کلام میں بانی نے صرف چھ شعر رکھے ہیں۔ کتاب میں شامل بانی کے نایاب کلام کے تحت پوری غزل کو درج کیا گیا ہے۔

'حرف معتبر' کی پہلی غزل میں سات شعر ہیں۔ اس غزل کا مطلع ہے۔

زماں مکاں تھے مرے سامنے بکھرتے ہوئے
میں ڈھیر ہو گیا طول سفر سے ڈرتے ہوئے

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے پاس 'حرف معتبر' کا جو ذاتی نسخہ ہے اس میں فاروقی صاحب کے قلم سے چند اشعار کا اضافہ ہے۔ یہ اشعار بھی سخت انتخاب کی وجہ سے مجموعۂ کلام میں شامل نہیں ہو سکے۔

شرار بوسہ ہی اس سنگ لب سے ہو پیدا
کہ میرے سر میں کئی لفظ ہیں ٹھٹھرتے ہوئے

جلائیں گے غم ساحل پہ کشتیاں اپنی
اس آبشار تماشا میں پاؤں دھرتے ہوئے
مرے لہو کی لپک میں رہے وہ ہاتھ وہ پاؤں
کچھ آئینے سے کہیں ڈوبتے ابھرتے ہوئے

بانی کی ایک اور مشہور غزل کا مطلع ہے۔

عجیب تجربہ تھا بھیڑ سے گزرنے کا
اسے بہانہ ملا مجھ سے بات کرنے کا

یہ غزل بانی کے پہلے مجموعۂ کلام 'حرف معتبر' میں چودہ اشعار پر مشتمل ہے مگر شمس الرحمن فاروقی صاحب کے ذاتی نسخے میں مزید اشعار فاروقی صاحب کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ اشعار غزل کی اولین صورت میں تھے مگر انتخاب کے وقت ان اشعار کو حذف کر دیا گیا۔ حذف شدہ اشعار کو درج کیا جا رہا ہے۔

جنوں بھی سر میں ہو اس بحر سے گزرنے کا
یہی نہیں کہ ارادہ ہو ڈوب مرنے کا
نکل پڑا تو میں چلتا گیا یونہی بے سمت
نہ تھا جواز کوئی راہ میں ٹھہرنے کا
مہک اٹھی کوئی تصویر سبز پتوں کی
چمک گیا کہیں پانی ہوا کے جھرنے کا
کھلا ہوا کسی منزل بہار صحرا میں
میں منتظر ہوں ہوا کی طرح بکھرنے کا
ہو اس کے عکس کا آنکھوں میں ذائقہ تو پھر
چکھو مزا بھی کبھی اس سے بات کرنے کا

'حرف معتبر' کی ایک اور غزل جس کا مطلع ہے۔

چاند سے سارا آسماں خالی
ہر جگہ ہے یہاں وہاں خالی

یہ غزل پہلی بار ماہ نامہ تحریک (مارچ 1963) میں شائع ہوئی۔ یہ غزل نو(9) شعر کی ہے مگر اس کے علاوہ بھی کچھ اشعار ہیں جو مجموعہ کلام میں جگہ نہیں پا سکے۔ مثلاً۔

کوہساروں کے بیچ جیسے شگاف
کچھ تو ہے اپنے درمیاں خالی
شیخ دیں ماہ وش کا ذکر نہ کر
لطف سے ہے ترا بیاں خالی

دراصل بانی اپنے اشعار پر مستقل غور و فکر کرتے رہتے تھے یہاں تک کہ شائع ہو جانے کے بعد بھی غور و فکر کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ بانی کی ایک غزل شب خون، (شمارہ: 89) میں شائع ہوئی۔ سات شعروں پر مشتمل اس غزل کا مطلع ہے۔

صبح کی پہلی دعا سے آشنا ہوتا ہوا
ایک سناٹا ہے مانوس صدا ہوتا ہوا

اسی غزل کا ایک شعر ہے۔

اک نظر امکاں ہزار امکاں سفر کرتی ہوئی
ایک منظر سو پرت، یکسر نیا ہوتا ہوا

یہ غزل اب بانی کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ بانی کے کلام کو بار بار پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ یہ غزل نہ سہی مگر غزل کے جو اچھے مصرعے تھے بانی نے ان کو ضائع نہیں ہونے دیا بلکہ دوسری غزل میں یہ مصرعے کھپا لیے گئے۔ 'حساب رنگ' کی تیسری غزل کا مطلع ہے۔

خاک و خوں کی وسعتوں سے باخبر کرتی ہوئی
اک نظر امکاں ہزار امکاں سفر کرتی ہوئی

اندازہ ہوتا ہے کہ بانی حقیقی تخلیق کار تھا اس کا جینا اور مرنا فن کے ساتھ تھا۔ مسلسل غور و فکر بانی

کا ایک اہم تخلیقی فریضہ تھا۔ درج بالا شعر سے عیاں ہے کہ بانی نے رسالہ میں اشاعت کے بعد غزل کو حرف آخر نہیں سمجھا بلکہ اس پر مسلسل غور وفکر کرتے رہے۔ نتیجے کے طور پر نہ صرف یہ کہ بیشتر اشعار تبدیل ہوئے بلکہ ان کی صورت بھی پہلے سے بہتر ہوگئی۔ یہاں بانی کی تخلیقی زندگی پر ان کا ہی شعر صادق آتا ہے۔

پیہم موج امکانی میں
اگلا پاؤں نئے پانی میں

اشعار / مصرعوں کی تبدیلی صرف غزلوں تک محدود نہیں بلکہ بانی کا یہ رویہ نظموں کے ساتھ بھی رہا۔ بانی کی ایک نظم 'آہٹ' ماہ نامہ تحریک (اکتوبر1963) میں شائع ہوئی تھی۔ مگر جب یہ نظم 'حرف معتبر' میں شائع ہوئی تو اس کا عنوان تبدیل کرکے 'سفر مختصر' کر دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ نظم کے ابتدائی مصرعے بھی تبدیل کیے گئے۔ تحریک میں نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

انتظار....
ہر ستارے کے درخشاں ہاتھ میں ہنستا تھا سناٹے کا پھول
ایک دم آہٹ ہوئی!

جبکہ مجموعۂ کلام کے ابتدائی مصرعے یہ ہیں۔

ہر ستارے کے روپہلے ہاتھ میں ہنستا تھا
سناٹے کا پھول
ایک دم آہٹ ہوئی!

ان چند مثالوں سے فن کے تئیں بانی کی سنجیدگی اور غور وفکر کے رویے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ شاعری بانی کے یہاں مستقل غور وفکر اور ریاضتِ فن سے عبارت تھی۔ اسے خوب سے خوب تر کی جستجو کہا جا سکتا ہے جو واقعتاً شعر وادب کے لیے ایک بڑی نعمت ہے۔ ان اشعار کے مطالعہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بانی نے بالعموم اپنے کمزور اشعار کو نئے سرے سے کہا اور ان کی صورت بہتر کی۔ جو غزلیں یا نظمیں مجموعہ میں شامل نہ ہو سکیں وہ شائع شدہ کلام

کے مقابلے نسبتاً کمزور تھیں۔

آئندہ صفحات میں بانی کی اُن غزلوں اور نظموں کو پیش کیا جارہا ہے جو رسائل و جرائد میں شائع ہونے کے باوجود مجموعۂ کلام میں جگہ نہیں پاسکیں۔

نایاب کلام

نہیں سب خیریت ہے میں ہی رہتا ہوں یہاں اب بھی
تو کیا تم کو ہے اس گھر کے اجڑنے کا گماں اب بھی
سنائی دیں کھلے باہر میں میرے گھر کی آوازیں
یہی گھر ہے مگر میرے لیے جائے اماں اب بھی
کہیں آہ و فغاں ہو اس طرف ہی ہر نظر اٹھے
بسیرا ہے کن آوازوں کا یہ سونا مکاں اب بھی
سماں جو پہلے آتی آہٹوں کا تھا وہ اب بھی ہے
محبت ہے وہی یادوں بھری تنہائیاں اب بھی
وہی ہوں میں رہا جو کارواں در کا رواں تنہا
وہی ہوں ڈھونڈتے ہو جس کا تم نام و نشاں اب بھی
تمہارے ساتھ ہوں تم میں سے کوئی اک نہیں ہوں میں
بڑھا لو فاصلے یہ میرے اپنے درمیاں اب بھی
یہ طرز فکر جیسے پربتوں پر شام پڑ جائے
تو پھر کیوں تلخ لہجے میں ہے شہروں کا دھواں اب بھی

(شب خون شمارہ:80،جنوری1973)

O

صبح کی پہلی دعا سے آشنا ہوتا ہوا
ایک سناٹا ہے مانوس صدا ہوتا ہوا
جاتے موسم کی عجب تصویر ہے چاروں طرف
درمیاں اس کے ہے اک پتا ہرا ہوتا ہوا

اتنی آگاہی تو ہے میں بڑھ رہا ہوں کس طرف
یہ نہیں معلوم کس سے ہوں جدا ہوتا ہوا
اک نوا آہستہ آہستہ فنا ہوتی ہوئی
ایک حرف صد طلب چپ چپ ادا ہوتا ہوا
دیکھ میں اپنی جگہ سے اک قدم سرکا نہیں
دیکھ تیرا ہی نشانہ ہے خطا ہوتا ہوا
اک نظر، امکاں ہزار امکاں، سفر کرتی ہوئی
ایک منظر، سوبرت، یکسر نیا ہوتا ہوا
بڑھ رہا ہے کون اپنا راستہ لیتے ہوئے
ست ہم راہوں سے چپکے سے خفا ہوتا ہوا

(شب خون، شمارہ 89 مارچ، اپریل 1974)

O

رہی نہ یارو آخر سکت ہواؤں میں
چار دیے روشن ہیں چار دشاؤں میں
کائی جمی تھی سینے میں کب سے
چیخ اٹھا وہ آکر کھلی فضاؤں میں
اپنی گم آواز میں آؤ تلاش کریں
سبز پرندوں کی سیال صداؤں میں
میں ہی کرید رہا تھا خاک کی پرتوں کو
وہ بھی جھانک رہا تھا دور خلاؤں میں
ٹھنڈی چھاؤں دیکھ کے وہ آبیٹھا تھا
الجھ گیا برگد کی گھنی جٹاؤں میں

گھاٹ گھاٹ کوشش کی پار اترنے کی
لہر کوئی دشمن تھی سب دریاؤں میں
وہ سرسبز زمینوں تک ہم سفر رہا
اڑ نہ سکا پھر میرے ساتھ ہواؤں میں
پانی ذرا برسنے دے پھر منظر دیکھ
رنگ چھپے ہیں سب ان سیہ گھٹاؤں میں
آ میں تیرے من میں جھانکوں اور بتاؤں
کیوں تاثیر نہیں ہے تیری دعاؤں میں
سب آپس میں لڑ کر بستی چھوڑ گئے
خوش خوش جا آباد ہوئے صحراؤں میں
ایک طلب نے بانی بہت خراب کیا
آخر ہم بھی ہوئے شمار گداؤں میں

(ماہ ماہنامہ تحریک' نومبر 1976)

O

وہ تغافل ہے کہ ایمان وفا پر آئے
یاد تم اپنی عنایات سے بڑھ کر آئے
یوں تو قصے نہیں کم ہم کو رلانے کے لیے
اک اچٹتا سا تعلق بھی میسر آئے
آشنائی ترے جلووں سے مگر کیا تھی ضرور
اک نظر دیکھ لیں ہم رونقیں جی بھر آئے
یوں تو کچھ کہہ کے ترے عہد وفا سے پہلے
غم وہ کیا تھا کہ ہم اک عمر بسر کر آئے

اپنی خاموش نگاہی کو نہ اک راز سمجھ
غم زدوں تک ترے پیغام برابر آئے
دل اس انداز سے قصے ترے دہراتا ہے
ہم تری بزم سے جیسے ابھی اٹھ کر آئے
کیا خبر ترک تعلق ہی تجھے ہو منظور
اب گلہ کرتے بھی اس جی کو بہت ڈر آئے
اب چھلکتے ہوئے پیمانے کی زد میں ہے حیات
کوئی الزام خرابات نشیں پر آئے
اف سر رہ تری بیگانہ و سادہ سی نگاہ
گویا چپ رہنے کی مشکل بھی ہمیں پر آئے
ذکر دل کیا کہ ملاقات کا وہ ماتم ہے
داستان دگراں بھی نہ زباں پر آئے

(ماہ نامہ تحریک مئی جون 1958 ص:22)

○

جواب شوخی حسن گریزاں ہوگیا ہوں میں
مٹا کر زندگی کچھ کچھ نمایاں ہوگیا ہوں میں
مری ہستی کے غم آخر سمجھتی کیوں نہیں دنیا
کوئی افسانہ زلف پریشاں ہوگیا ہوں میں
بہت تاریک تھی راہ محبت تم بھٹک جاتے
تمناؤں کا خوں کرکے فروزاں ہوگیا ہوں میں
مرے دل میں بھی شاید شوق تجدید محبت تھا
نظر اٹھتی ہے تیری اور پشیماں ہوگیا ہوں میں

سکوت عشق میں اک تشنگی تھی چوٹ کھانے کی
بقدر شوق غم پاکر پریشاں ہوگیا ہوں میں
مرے دل کو رہا ہے مدتوں احساس ناکامی
مگر ہر واردات غم پہ حیراں ہوگیا ہوں میں
مجھے سکھلا رہے ہو آج کیا آداب آزادی
کہ مانوس درودیوار زنداں ہوگیا ہوں میں

(شاہراہ: مارچ1955)

یہ ایک لمحہ

درخت کی سب سے اونچی چوٹی پہ ایک پتہ کھڑا ہے پیاسا
جو سرد موسم کے ہاتھ سے خالی خالی لمحات کے
سبو چا نثار ہا ہے!
رواں دواں ابر اپنی دھن میں بلندیوں کا وقار
بن کر گزر گئے ہیں
ہوا چلی ہے۔ ہوا بڑی سرد ہو رہی ہے
ہوا کچھ اس طرح چل رہی ہے کہ اپنے سینے کے زیر و بم
گن رہی ہے گویا!
کہ شاید اب یہ اداس موسم بدل رہا ہے!!!
عجب ہے شب کا تھکا سا منظر۔ نہ چاند ہے اور
نہ کوئی تارا
مگر مجھے تو یہ ایک لمحہ کنار دریائے روشنی ہے!
میں دیکھتا ہوں نہ چاند ہے اور نہ کوئی تارا
تھکا تھکا سا ہر ایک نظارا
ہوا بڑی سرد ہو رہی ہے
ہوا کا ایک تند و تیز جھونکا
کچھ اس طرح ٹہنیوں پہ ہنستا گزر گیا ہے
وہ ایک پتہ، بلند چوٹیوں پہ ایستادہ تھا، گزر گیا ہے!
اور اب یہ پتہ، بہت ہی پیاسا۔
عجیب تیز و طویل سانسیں خلا میں لیتا

زمیں کے بھگیے، سیاہ سینے سے آ کے اک دم چمٹ
گیا ہے!
مگر سحر ہوتے ہوتے ہر سمت برف ہو گی!!
یہ ایک لمحہ کہ جس نے میری نگاہ کو دی ہے روشنی
ورنہ ہر تنزل کی داستاں کون جانتا ہے!

(شاہراہ: جولائی 1957)

کچھ اپنے متعلق

ملے بانی سے ہم، وہ مختصر از بس لب ولہجہ
کتابیں ہاتھ میں اور ڈھیلا ڈھالا پیرہن اس کا
بہت آہستہ چلنا۔ اور مبہم گفتگو کرنا!
کہ ایسے نوجواں آوارۂ وبیکار پھرتے ہیں

نہ جانے تم کو بانی میں وہ کیا خوبی نظر آئی
کہ اک مدت سے تم جس کے بنے پھرتے ہو شیدائی
مجھے تو جان پڑتا ہے وہ دیوانہ، وہ سودائی
کہ ایسے نوجواں آوارہ وبیکار پھرتے ہیں

قیامت اس پہ تم کہتے ہو وہ شاعر بھی اچھا ہے
چلو اچھا ہو یہ بھی بڑا دلچسپ قصہ ہے
کہ ہندوستان میں اردو کا مستقبل ہی اب کیا ہے
کہ ایسے نوجواں آوارۂ وبیکار پھرتے ہیں

(شاہراہ: نومبر 1957)

شملہ

اے کپاسی ابر میں لپٹے دیا
مہرباں یاروں کے شہر
میں تری راہوں سے اترا ہوں
لرزتے پاؤں سے
صبح رخصت کا سلام
ارماں نظر، آزاد، طلعت، طور کے نام
اور وادی میں برستے
نم غلافی نور کے نام
جانے کتنے موڑ تھے...
ہر موڑ پر میں رک کے اور آنکھیں پلٹ کر
نیم بارش دھند میں سے
دیکھتا تھا دور ہوتے دوستوں کے اجلے چہرے بار بار
اے کپاسی ابر میں لپٹے دیا
ترے پیارے پربتوں کے درمیاں
میری دعائے خیر پھیلے
میرے یاروں کے
حسیں چہرے
کبھی میلے نہ ہوں
جاتے جاتے مڑ کے تجھ کو دیکھ لوں کہرے کی صف کے آر پار
مڑ کے تجھ کو دیکھ لوں پھر ایک بار!

اے کپاسی ابر میں لپٹے دیا

(ماہ نامہ تحریک جولائی 1976، ص:8)

ارمان شہابی، پریم کمار نظر، آزاد گلاٹی، طلعت عرفانی، کرشن کمار طور

متل صاحب کی نذر

عجب عجب سا لکھا تھا زیاں تمہارے لیے
ذرا سی بات بنی امتحاں تمہارے لیے
تمہارے سر میں وہ سودا کہ خود سفر انگیز
کہیں نہ تھی کوئی جائے اماں تمہارے لیے
تمہیں جنوں تھا کہ دیکھو سراب کیا شے ہے
کہیں تھا منتظر آب رواں تمہارے لیے
تمہیں نے پڑھ لیا تحریر آشنا تم تھے
کچھ اور تھا پس لفظ و بیاں تمہارے لیے
ورق ورق تھا تمہارے لیے کتاب کتاب
کہ حرف حرف تھا اک داستاں تمہارے لیے
تمہیں نے قتل کیا آفتاب کاذب کو
حسیں ہے شام تو شب ہے جواں تمہارے لیے
ذرا بھی کم نہ ہوا عشق سبز مٹی سے
تمام سرخ ہوا آسماں تمہارے لیے

(ماہ نامہ تحریک اکتوبر 1975)

(گوپال متل کی 68ویں سال گرہ پر دہلی رائٹرز ایسوسی ایشن کی طرف سے منعقدہ جلسے میں پڑھی گئی ہے۔)

عقیدت کا اک پھول
(بسمل سعیدی کے لیے)

آج اک عمر ہوئی
جانے کیا گمشدہ لمحہ تھا...
تری ذات سے منسوب ہوا
اور جس نے تجھے
بے رشتگی وقت کی تصویر بنانا چاہا
جانے کیا گمشدہ جھونکا تھا
ترے شوق میں ڈھونڈا کیا پہچان اپنی
اور جس نے تجھے
...ویران مقاموں کا سفر سونپ دیا...
آج... اک عمر ہوئی
غم تری آنکھوں میں ہے
غم تری آواز میں ہے
ایک سُر کتنا جدا ساز میں ہے
ایک موسم... ترے سینے کا دھواں
ایک شعلے کے سوا...
اب کوئی منظر نہیں اتنا ارزاں
اک مہک تیرے لہو کی
تو ہی بسمل اس کا
اک فضا تیرے قریب اور بھی تھی
تو ہی قاتل اس کا

(ماہ نامہ تحریک دسمبر 1975)

انتخابِ کلام

(1)

زماں مکاں تھے مرے سامنے بکھرتے ہوئے
میں ڈھیر ہوگیا طولِ سفر سے ڈرتے ہوئے
دکھا کے لمحۂ خالی کا عکسِ لاتفسیر
یہ مجھ میں کون ہے مجھ سے فرار کرتے ہوئے
بس ایک زخم تھا دل میں جگہ بناتا ہوا
ہزار غم تھے مگر بھولتے بسرتے ہوئے
وہ ٹوٹتے ہوئے رشتوں کا حسن آخر تھا
کہ چپ سی لگ گئی دونوں کو بات کرتے ہوئے
عجب نظارا تھا بستی کا اس کنارے پر
سبھی بچھڑ گئے دریا سے پار اُترتے ہوئے
میں ایک حادثہ بن کر کھڑا تھا رستے میں
عجب زمانے مرے سر سے تھے گزرتے ہوئے
وہی ہوا کہ تکلف کا حسن بیچ میں تھا
بدن تھے قُرب تہی لمس سے بکھرتے ہوئے

(2)

پتہ پتہ بھرتے شجر پر ابر برستا دیکھو تم
منظر کی خوش تعمیری کو لمحہ لمحہ دیکھو تم
مجھ کو اِس دلچسپ سفر کی راہ نہیں کھوٹی کرنی
میں عجلت میں نہیں ہوں یارو، اپنا رستہ دیکھو تم
آنکھ سے آنکھ نہ جوڑ کے دیکھو سُوئے افق اے ہمسفرو
لاکھوں رنگ نظر آئیں گے تنہا تنہا دیکھو تم
آنکھیں، چہرے، پاؤں سبھی کچھ بکھرے پڑے ہیں رستے میں
پیش رووں پر کیا کچھ بیتی، جاکے تماشہ دیکھو تم
کیسے لوگ تھے، چاہتے کیا تھے، کیوں وہ یہاں سے چلے گئے
گُنگ گھروں سے مت کچھ پوچھو، شہر کا نقشہ دیکھو تم
میرے سر ہے شراپ کسی کا، چھوڑ دو میرا ساتھ یہیں
جانے اِس ویران ڈگر پر آگے کیا کیا دیکھو تم
اب تو تمہارے بھی اندر کی بول رہی ہے مایوسی
مجھ کو سمجھانے بیٹھے ہو، اپنا لہجہ دیکھو تم
پلک پلک من جوت سجا کر کوئی گگن میں بکھر گیا
اب ساری شب ڈھونڈو اس کو تارا تارا دیکھو تم
بھاری رنگوں سے ڈرتا سا رنگ جُدا اِک ہلکا سا
صاف کہیں نہ دکھائی دے گا آڑھا ترچھا دیکھو تم
پانی سب کچھ اندر اندر دور بہا لے جاتا ہے . . .
کھوئی شے اِس گھاٹ نہ ڈھونڈو ساتوں دریا دیکھو تم

جیسے میرے سارے دشمن مرے مقابل ہوں اِک ساتھ
پاؤں نہیں آگے اٹھ پاتے زور ہوا کا دیکھو تم
ابھی کہاں معلوم یہ تم کو ویرانے کیا ہوتے ہیں
میں خود ایک کھنڈر ہوں جس میں وہ آنگن آ دیکھو تم
ان بن گہری ہو جائے گی یونہی سے گذرنے پر
اُس کو منانا چاہوگے جب،بس نہ چلے گا . . . دیکھوتم
ایک اِسی دیوار کے پیچھے، اور کیا کیا دیواریں ہیں
اک دیوار بھی راہ نہ دے گی سر بھی ٹکرا دیکھو تم
ایک اتھاہ گھنی تاریکی کب سے تمہاری تاک میں ہے
ڈال دو ڈیرہ وہیں، جہاں پر نور ذرا سا دیکھو تم
سچ کہتے ہو، اِن راہوں پر چین سے آتے جاتے ہو
اب تھوڑا اس قید سے نکلو، کچھ ان دیکھا دیکھو تم
خالی خالی سے لمحوں کے پھول ملیں گے پوجا کو
آنے والی عمر کے آگے، دامن پھیلا دیکھو تم
ہم پہنچے ہیں بیچ بھنور کے روگ لیے دنیا بھر کے
اور کنارے پر دنیا کو لوٹ کے جاتا دیکھو تم
اک عکسِ موہوم عجب سا اس دھندلے خاکے میں ہے
صاف نظر آئے گا تم کو اب جو دوبارہ دیکھو تم
اپنی خوش تقدیری جانو اب جو راہیں سہل ہوئیں
ہم بھی ادھر ہی سے گذرے تھے، حال ہمارا دیکھو تم

رات، دعا مانگی تھی بانی ہم نے سب کے کہنے پر
ہاتھ ابھی تک شل ہیں اپنے، قہر خدا کا دیکھو تم

(3)

ہرے بدن میں پگھلتا ہوا سا کچھ تو ہے
اِک اور ذات میں ڈھلتا ہوا سا کچھ تو ہے
مری صدا نہ... سہی ہاں... مرا لہو نہ سہی
یہ موج موج اچھلتا ہوا سا کچھ تو ہے
کہیں نہ آخری جھونکا ہو مٹتے رشتوں کا
یہ درمیاں سے نکلتا ہوا سا کچھ تو ہے
نہیں ہے آنکھ کے صحرا میں ایک بوند سراب
مگر یہ رنگ بدلتا ہوا سا کچھ تو ہے
جو میرے واسطے کل زہر بن کے نکلے گا
ترے لبوں پہ سنبھلتا ہوا سا کچھ تو ہے
یہ عکسِ پیکرِ صد لمس ہے، نہیں... نہ سہی
کسی خیال میں ڈھلتا ہوا سا کچھ تو ہے
بدن کو توڑ کے باہر نکلنا چاہتا ہے
یہ کچھ تو ہے یہ مچلتا ہُوا سا کچھ تو ہے
کسی کے واسطے ہوگا پیام یا کوئی قہر
ہمارے سر سے یہ ٹلتا ہُوا سا کچھ تو ہے
یہ میں نہیں... نہ سہی، اپنے سرد بستر پر
یہ کروٹیں سی بدلتا ہُوا سا کچھ تو ہے

وہ کچھ تو تھا میں سہارا جسے سمجھتا تھا
یہ میرے ساتھ پھسلتا ہُوا سا کچھ تو ہے
بکھر رہا ہے فضا میں یہ دود روشن کیا
ادھر پہاڑ کے جلتا ہُوا سا کچھ تو ہے
مرے وجود سے جو کٹ رہا ہے گام بہ گام
یہ اپنی راہ بدلتا ہُوا سا کچھ تو ہے
جو چاٹتا چلا جاتا ہے مجھ کو اے بانی
یہ آستین میں پلتا ہوا سا کچھ تو ہے

(4)

نہ منزلیں تھیں نہ کچھ دل میں تھا نہ سر میں تھا
عجب نظارۂ لاسمتیت نظر میں تھا
عتاب تھا کسی لمحے کا اک زمانے پر
کسی کو چین نہ باہر تھا اور نہ گھر میں تھا
چھپا کے لے گیا دنیا سے اپنے دل کے گھاؤ
کہ ایک شخص بہت طاق اِس ہُنر میں تھا
کسی کے لوٹنے کی جب صدا سنی تو کھلا
کہ میرے ساتھ کوئی اور بھی سفر میں تھا
کبھی میں آب کے تعمیر کردہ قصر میں ہوں
کبھی ہوا میں بنائے ہوئے سے گھر میں تھا
جھجک رہا تھا وہ کہنے سے کوئی بات ایسی
میں چپ کھڑا تھا کہ سب کچھ مری نظر میں تھا
یہی سمجھ کے اُسے خود صدا نہ دی میں نے
وہ تیز گام کسی دور کے سفر میں تھا

کبھی ہوں تیری خموشی کے کٹتے ساحل پر
کبھی میں لوٹتی آواز کے بھنور میں تھا
ہماری آنکھ میں آکر بنا اِک اشک، وہ رنگ
جو برگِ سبز کے اندر، نہ شاخِ تر میں تھا
کوئی بھی گھر میں سمجھتا نہ تھا مرے دکھ سکھ
اک اجنبی کی طرح میں خود اپنے گھر میں تھا
ابھی نہ برسے تھے بانیؔ گھرے ہوئے بادل
میں اڑتی خاک کی مانند رہ گذر میں تھا

(5)

اک گلِ تر بھی شرر بھی نکلا
بسکہ ہر کام ہنر سے نکلا
میں ترے بعد پھر اے گم شدگی
خیمۂ گردِ سفر سے نکلا
غم نکلتا نہ کبھی سینے سے
اک محبت کی نظر سے نکلا
اے صفِ ابرِ رواں تیرے بعد
اِک گھنا سایہ شجر سے نکلا
راستے میں کوئی دیوار بھی تھی
وہ اِسی ڈر سے نہ گھر سے نکلا
ذکر پھر اپنا وہاں مدت بعد
کسی عنوانِ دگر سے نکلا
ہم کہ تھے نعرۂ محرومی میں
یہ نیا ورد کدھر سے نکلا

ایک ٹھوکر پہ سفر ختم ہوا
ایک سودا تھا کہ سر سے نکلا
ایک اِک قصۂ بے معنی کا
سلسلہ تیری نظر سے نکلا
لمحے، آدابِ تسلسل سے چھٹے
میں کہ امکانِ سحر سے نکلا
سرِ منزل ہی کھلا اے بانی
کون کس راہ گذر سے نکلا

(6)

پی چکے تھے زہرِ غم... خستہ جاں پڑے تھے ہم... چین تھا
پھر کسی تمنا نے سانپ کی طرح ہم کو ڈس لیا
میرے گھر تک آتے ہی، کیوں جدا ہوئی تجھ سے، کچھ بتا
ایک اور آہٹ بھی ساتھ ساتھ تھی تیرے، اے صبا
سر میں جو بھی تھا سودا اڑ گیا خلاؤں میں مثلِ گرد
ہم پڑے ہیں رستے میں، نیم جاں شکستہ دل خستہ پا
سب کھڑے تھے آنگن میں اور مجھ کو تکتے تھے، بار بار
گھر سے جب میں نکلا تھا مجھ کو روکنے والا کون تھا
جوش گھٹتا جاتا تھا، ٹوٹتے سے جاتے تھے حوصلے
اور سامنے، بانی دوڑتا سا جاتا تھا راستہ

(7)

میں چپ کھڑا تھا، تعلق میں اختصار جو تھا
اُسی نے بات بنائی وہ ہوشیار جو تھا

پہنچ دیا کسی جھونکے نے لا کے منزل پر
ہوا کے سر پہ کوئی دیر سے سوار جو تھا
محبتیں نہ رہیں اس کے دل میں میرے لیے
مگر وہ ملتا تھا ہنس کر کہ وضع دار جو تھا
عجب غرور میں آکر برس پڑا بادل
کہ پھیلتا ہوا چاروں طرف غبار جو تھا
قدم قدم رم پامال سے میں تنگ آکر
ترے ہی سامنے آیا، ترا شکار جو تھا

(8)

دن کو دفتر میں اکیلا، شب بھرے گھر میں اکیلا
میں کہ عکسِ منتشر ایک ایک منظر میں اکیلا
اُڑ چلا وہ اِک جدا خاکہ لیے سر میں اکیلا
صبح کا پہلا پرندہ آسماں بھر میں اکیلا
کون دے آواز خالی رات کے اندھے کنوئیں میں
کون اترے خواب سے محروم بستر میں اکیلا
اس کو تنہا کر گئی کروٹ کوئی پچھلے پہر کی
پھر اُڑا بھاگا وہ سارا دن نگر بھر میں اکیلا
ایک مدھم آنچ سی آواز سرگم سے الگ کچھ
رنگ اِک دبتا ہوا سا، پورے منظر میں اکیلا
بولتی تصویر میں اک نقش لیکن کچھ ہٹا سا
ایک حرفِ معتبر، لفظوں کے لشکر میں اکیلا
جاؤ موجو، میری منزل کا پتہ کیا پوچھتی ہو
اک جزیرہ دور افتادہ سمندر میں اکیلا

جانے کس احساس نے آگے نہیں بڑھنے دیا تھا
اب پڑا ہوں قید، میں رستے کے پتھر میں اکیلا
ہو بہو میری طرح چپ چاپ، مجھ کو دیکھتا ہے
اک لرزتا خوبصورت عکس، ساغر میں اکیلا

(9)

تمام راستہ پھولوں بھرا ہے میرے لیے
کہیں تو کوئی دعا مانگتا ہے میرے لیے
تمام شہر ہے دشمن تو کیا ہے میرے لیے
میں جانتا ہوں ترا در کھلا ہے میرے لیے
مجھے بچھڑنے کا غم تو رہے گا ہم سفرو
مگر سفر کا تقاضا جدا ہے میرے لیے
وہ ایک عکس کہ پل بھر نظر میں ٹھہرا تھا
تمام عمر کا اب سلسلہ ہے میرے لیے
عجیب درگذری کا شکار ہوں اب تک
کوئی کرم ہے نہ کوئی سزا ہے میرے لیے
گذر سکوں گا نہ اس خواب خواب بستی سے
یہاں کی مٹی بھی زنجیر پا ہے میرے لیے
اب آپ جاؤں تو جاکر اسے سمیٹوں میں
تمام سلسلہ بکھرا پڑا ہے میرے لیے
یہ حسنِ ختم سفر یہ طلسمِ خانۂ رنگ
کہ آنکھ جھپکوں تو منظر نیا ہے میرے لیے

یہ کیسے کوہ کے اندر میں دفن تھا بانی
وہ ابر بن کے برستا رہا ہے میرے لیے

(10)

پیہم موجِ امکانی میں
اگلا پاؤں نئے پانی میں
صفِ شفق سے مرے بستر تک
ساتوں رنگ فراوانی میں
بدن، وصال آہنگ ہوا سا
قبا، عجب پریشانی میں
کیا سالم پہچان ہے اس کی
وہ کہ نہیں اپنے ثانی میں
ٹوک کے جانے کیا کہتا وہ
اُس نے سنا سب بے دھیانی میں
یاد تری، جیسے کہ سرِ شام
دُھند اُتر جائے پانی میں
خود سے کبھی مل لیتا ہوں میں
سناٹے میں ویرانی میں
آخر سوچا دیکھ ہی لیجے
کیا کرتا ہے وہ من مانی میں
ایک دیا آکاش میں بانی
ایک چراغ سا پیشانی میں

(11)

فضا کہ پھر آسمان بھر تھی
خوشی سفر کی، اُڑان بھر تھی
وہ کیا بدن بھر خفا تھا مجھ سے
کہ آنکھ بھی چپ گمان بھر تھی
اُفق کہ پھر ہو گیا منور
لکیر سی اِک کہ دھیان بھر تھی
وہ موج کیا ٹوٹ کر گری ہے
تو کیا یہ بس امتحان بھر تھی
وہ اک فسانہ زبان بھر تھا
یہ اک سماعت کہ کان بھر تھی
سبب کہ اب تک وہ پوچھتا ہے
مری اداسی کہ آن بھر تھی
کھلا سمندر کہ چاند بھر تھا
ہوا کہ شب بادبان بھر تھی
ہمیں نے مسمار کر دکھائی
وہ اک رکاوٹ چٹان بھر تھی
شفق بنی آسماں میں جا کر
جو خوں کی بوند اک نشان بھر تھی
نہ لوٹ پایا وہ جانتا تھا
کہ واپسی درمیان بھر تھی
کسی غزل میں نہ آئی بانی
وہ اک اذیت کہ جان بھر تھی

(12)

خاک وخوں کی وسعتوں سے باخبر کرتی ہوئی
اک نظر امکاں ہزار امکاں سفر کرتی ہوئی
اک عجب بے چین منظر، آنکھ میں ڈھلتا ہوا
اک خلش سفاک سی سینے میں گھر کرتی ہوئی
اک کتاب صد ہنر تشریح زائل کا شکار
ایک مہمل بات جادو کا اثر کرتی ہوئی
جسم اور اک نیم پوشیدہ ہوس آمادگی
آنکھ اور سیرِ لباس مختصر کرتی ہوئی
تشنگی کا زہر سینے کو سیہ کرتا ہوا
اک طلب اپنے نشے کو تیز تر کرتی ہوئی
وہ نگاہ اپنے لیے ہے صد حسابِ آرزو
اور مجھے بیگانۂ نفع و ضرر کرتی ہوئی

(13)

آج اک لہر بھی پانی میں نہ تھی
کوئی تصویر روانی میں نہ تھی
ولولہ مصرعۂ اول میں نہ تھا
حرکت مصرعۂ ثانی میں نہ تھی
کوئی آہنگ نہ الفاظ میں تھا
کیفیت کوئی معانی میں نہ تھی
خوں کا نم سادہ نوائی میں نہ تھا
خوں کی بو شوخ بیانی میں نہ تھی

کوئی مفہوم تصور میں نہ تھا
کوئی بھی بات کہانی میں نہ تھی
رنگ اب کوئی خلاؤں میں نہ تھا
کوئی پہچان نشانی میں نہ تھی
خوش یقینی میں نہ تھا اب کوئی نور
ضو کوئی خندہ گمانی میں نہ تھی
جی سلگنے کا دھواں خط میں نہ تھا
روشنی حرفِ زبانی میں نہ تھی
رنج بھولے ہوئے وعدے کا نہ تھا
لذت اب یاد دہانی میں نہ تھی
لو کہ چاند سی غزل بھی لکھ دی
آج کچھ زندگی بانی میں نہ تھی

(14)

سیرِ شبِ لامکاں اور میں
ایک ہوئے رفتگاں اور میں
سانس خلاؤں نے لی سینہ بھر
پھیل گیا آسماں اور میں
سر میں سلگتی ہوا تشنہ تر
دَم سے الجھتا دھواں اور میں
اسمِ ابد کی تلاشِ طویل
حسنِ شروعِ گماں اور میں
میری فراوانیاں نو بہ نو
اب ہے نشاطِ زیاں اور میں

دونوں طرف جنگلوں کا سکوت
شور بہت درمیاں اور میں
خاک و خلا بے چراغ اور شب
نقش و نوا بے نشاں اور میں
پھر مرے دل میں کوئی تازہ کھوٹ
پھر کوئی سخت امتحاں اور میں
کب سے بھٹکتے ہیں باہم الگ
لحۂ کم مہرباں اور میں
دور چھتوں پر برستا تھا قہر
چپ رہے کیوں تم یہاں اور میں
غیر مطالب کہیں اور ڈھونڈ
سہل بہت شرح جاں اور میں

(15)

محراب نہ قندیل، نہ اَسرار نہ تمثیل
کہہ اے ورقِ تیرہ، کہاں ہے تری تفصیل
اِک دُھند میں گم ہوتی ہوئی ساری کہانی
اک لفظ کے باطن سے الجھتی ہوئی تاویل
میں آخری پرتو ہوں کسی غم کے اُفق پر
اک زرد تماشا میں ہوا جاتا ہوں تحلیل
واماندۂ وقت آنکھ کو منظر نہ دکھا اور
ذمے ہے ہمارے ابھی اک خواب کی تشکیل
آساں ہوئے سب مرحلے اک موجۂ پا سے
برسوں کی فضا ایک صدا سے ہوئی تبدیل

(16)

عکس کوئی کسی منظر میں نہ تھا
کوئی بھی چہرہ کسی در میں نہ تھا
صبح اک بوند گھٹاؤں میں نہ تھی
چاند بھی شب کو سمندر میں نہ تھا
کوئی جھنکار رگِ گل میں نہ تھی
خواب کوئی کسی پتھر میں نہ تھا
شمع روشن کسی کھڑکی میں نہ تھی
منتظر کوئی کسی گھر میں نہ تھا
کوئی وحشت بھی مرے دل میں نہ تھی
کوئی سودا بھی مرے سر میں نہ تھا
تھی نہ لذت سخن اول میں
ذائقہ حرفِ مکرر میں نہ تھا
پیاس کی دھند بھی ہونٹوں پہ نہ تھی
اوس کا قطرہ بھی ساغر میں نہ تھا
مٹھی بھر اون نہ تھی بھیڑوں پر
لقمہ بھر گوشت کبوتر میں نہ تھا
جون میں تھی نہ سلگتی ہوئی لو
برف کا لمس دسمبر میں نہ تھا
چاند تارے کسی گردش میں نہ تھے
دل کسی شوق کے چکر میں نہ تھا
اب گرہ کوئی مقدر میں نہ تھی
خم کوئی گیسوئے ابتر میں نہ تھا

راہ شفاف تھی چادر کی طرح
یعنی کچھ بھی مری ٹھوکر میں نہ تھا
خود روی قلبِ قلندر میں نہ تھی
بے دھڑک حوصلہ لشکر میں نہ تھا
دن میں تھا کارِ جنوں کا نہ سرور
شب کا آرام بھی بستر میں نہ تھا
شاہ کردار تھا غائب، یعنی
ذکرِ دل شوق کے دفتر میں نہ تھا
یوں تو ہم ڈرتے تھے غم سے اب بھی
پر کوئی خاص مزہ ڈر میں نہ تھا
بعض طائر تو منڈیروں پہ نہ تھے
رزق کا ہمہمہ اکثر میں نہ تھا
میری پلکوں سے سفر کرتا ہوا
تھا کوئی سایہ کہ دم بھر میں نہ تھا
اک مہک بعد کی بارش میں نہ تھی
اِک دھواں صحنِ منور میں نہ تھا
کوئی تشبیہ علامت میں نہ تھی
استعارہ کوئی پیکر میں نہ تھا
کیا عجب فصل تھی ویرانی کی
پھول تک دستِ پیمبر میں نہ تھا
اب ہوا جاتی کہیں کیا لے کر
کچھ بھی ماحول مکدر میں نہ تھا

یوں اکیلے کا سفر تھا باقی
میں بھی خود اپنے برابر میں نہ تھا

(17)

لباس اُس کا علامت کی طرح تھا
بدن روشن عبارت کی طرح تھا
فضا صیقل ساعت کی طرح تھی
سکوت اس کا امانت کی طرح تھا
ادا موجِ تجسس کی طرح تھی
نفس خوشبو کی شہرت کی طرح تھا
بساط رنگ تھی مٹھی میں اس کی
قدم اس کا بشارت کی طرح تھا
گریزاں آنکھ دعوت کی طرح تھی
تکلف اک عنایت کی طرح تھا
خلش بیدار نشے کی طرح تھی
رگوں میں خوں مصیبت کی طرح تھا
تصور پر حنا بکھری ہوئی تھی
سماں آغوش خلوت کی طرح تھا
ہوس اندھی ضرورت کی طرح تھی
وہ خود دائم محبت کی طرح تھا
وہی اسلوب سادہ، شرحِ دل کا
کسی زندہ روایت کی طرح تھا

(18)

یہ ذرا سا کچھ اور ایک دم بے حساب سا کچھ
سرِشام سینے میں ہانپتا ہے سراب سا کچھ
وہ چمک تھی کیا جو پگھل گئی ہے نواحِ جاں میں
کہ یہ آنکھ میں کیا ہے شعلۂ زیرِ آب سا کچھ
کبھی مہرباں آنکھ سے پرکھ اس کو، کیا ہے یہ شے
ہمیں کیوں ہے سینے میں اس سبب اضطراب سا کچھ
وہ فضا نہ جانے سوال کرنے کے بعد کیا تھی
کہ ہلے تو تھے لب، ملا ہو شاید جواب سا کچھ
مرے چار جانب یہ کھنچ گئی ہے قنات کیسی
یہ دھواں ہے ختمِ سفر کا یا ٹوٹے خواب سا کچھ
وہ کہے ذرا کچھ تو دل کو کیا کیا خلل ستائے
کہ نہ جانے اُس کی ہے بات میں کیا خراب سا کچھ
نہ یہ خاک کا اجتناب ہی کوئی راستہ دے
نہ اڑان بھرنے دے، سر پہ یہ پیچ و تاب سا کچھ
سرِ شرح و اظہار جانے کیسی ہوا چلی ہے
بکھر گیا ہے سخن سخن، انتخاب سا کچھ
یہ بہار بے ساختہ چلی آئی ہے کہاں سے
تنِ زرد میں کھل اُٹھا ہے پیلے گلاب سا کچھ
ارے کیا بتائیں ہوائے امکاں کے کھیل کیا ہیں
کہ دلوں میں بنتا ہے ٹوٹتا ہے حباب سا کچھ
کبھی ایک پل بھی نہ سانس لی کھل کے ہم نے بانیؔ
رہا عمر بھر بلکہ جسم و جاں میں عذاب سا کچھ

(19)

صدائے دل، عبادت کی طرح تھی
نظرِ شمعِ شکایت کی طرح تھی
بہت کچھ کہنے والا چپ کھڑا تھا
فضا اجلی سی حیرت کی طرح تھی
کہا دل نے کہ بڑھ کے اس کو چھو لوں
ادا خود ہی اجازت کی طرح تھی
نہ آیا وہ مرے ہمراہ یوں تو
مگر اک شے رفاقت کی طرح تھی
میں تیز و سُست بڑھتا جا رہا تھا
ہوا حرفِ ہدایت کی طرح تھی
نہ پوچھ اس کی نظر میں کیا تھے معیار
پسند اُس کی رعایت کی طرح تھی
ملا اب کے وہ اک چہرہ لگائے
مگر سب بات عادت کی طرح تھی
نہ لڑتا میں کہ تھی چھوٹی سی اک بات
مگر ایسی کہ تہمت کی طرح تھی
کوئی شے تھی: بنی جو حسنِ اظہار
مرے دل میں اذیت کی طرح تھی

(20)

ہری سنہری، خاک اڑانے والا میں
شفق شجر تصویر بنانے والا میں

خلا کے سارے رنگ سمیٹنے والی شام
شب کی مژہ پر خواب سجانے والا میں
فضا کا پہلا پھول کھلانے والی صبح
ہوا کے سُر میں گیت ملانے والا میں
باہر بھیتر فصل اُگانے والا میں
ترے خزانے سدا لٹانے والا میں
چھتوں پہ بارش دور پہاڑی ہلکی دھوپ
بھیگنے والا پنکھ سکھانے والا میں
چاردشائیں جب آپس میں گھل مل جائیں
سناٹے کو دعا بنانے والا میں
گھنے بنوں میں، شنکھ بجانے والا تو
تری طرف گھر چھوڑ کے آنے والا میں

(21)

چلی ڈگر پر کبھی نہ چلنے والا میں
نئے انوکھے موڑ بدلنے والا میں
تم کیا سمجھو عجب عجب ان باتوں کو
آگ کہیں ہو یہاں ہوں جلنے والا میں
بہت ذرا سی اوس بھگونے کو میرے
بہت ذرا سی آنچ پگھلنے والا میں
بہت ذرا سی ٹھیس تڑپنے کو میرے
بہت ذرا سی موج اُچھلنے والا میں
بہت ذرا سا سفر بھٹکنے کو میرے
بہت ذرا سا ہاتھ سنبھلنے والا میں

بہت ذرا سی صبح بکنے کو میرے
بہت ذرا سا چاند مچلنے والا میں
بہت ذرا سی راہ نکلنے کو میرے
بہت ذرا سی آس بہلنے والا میں

(22)

تجھے ذرا دکھ: اور سسکنے والا میں
تری اُداسی دیکھ نہ سکنے والا میں
ترے بدن میں چنگاری سی کیا شے ہے
عکس ذرا سا اور چمکنے والا میں
ترے لہو میں بیداری سی کیا شے ہے
لمس ذرا سا اور مہکنے والا میں
تری ادا میں پُرکاری سی کیا شے ہے
بات ذرا سی اور جھجکنے والا میں
رنگوں کا اک باغ حسیں چہرہ تیرا
کیا کیا دیکھوں آنکھ جھپکنے والا میں
سنگ نہیں ہوں بات نہ مانوں موسم کی
ہوا ذرا سی اور لچکنے والا میں
سفر میں تنہا قدم اٹھانا مشکل ہو
ساتھ تمہارے کبھی نہ تھکنے والا میں

(23)

گھنی گھنیری رات سے ڈرنے والا میں
سناٹے کی طرح بکھرنے والا میں

جانے کون اس پار بلاتا ہے مجھ کو
چڑھی ندی کے بیچ اُترنے والا میں
رسوائی تو رسوائی منظور مجھے
ڈرے ڈرے سے پاؤں نہ دھرنے والا میں
مرے لیے کیا چیز ہے تجھ سے بڑھ کر یار
ساتھ ہی جینے،ساتھ ہی مرنے والا میں
سب کچھ کہہ کے توڑ لیا ہے ناطہ کیا
میں کیا بولوں بات نہ کرنے والا میں
طرح طرح کے ورق بتانے والا تو
تری خوشی کے رنگ ہی بھرنے والا میں
دائم ابدی وقت گذرنے والا تو
منظر سایہ دیکھ ٹھہرنے والا میں

(24)

موڑ تھا کیسا تجھے تھا کھونے والا میں
رو ہی پڑا ہوں کبھی نہ رونے والا میں
کیا جھونکا تھا چمک گیا تن من سارا
پتہ نہ تھا پھر راکھ تھا ہونے والا میں
لہر تھی کیسی — مجھے بھنور میں لے آئی
ندی کنارے ہاتھ بھگونے والا میں
رنگ کہاں تھا پھول کی پتی پتی میں
کرن کرن کی دھوپ پرونے والا میں
کیا دن بیتا سب کچھ آنکھ میں پھرتا ہے
جاگ رہا ہوں، مزے میں سونے والا میں

شہر خزاں ہے زردی اوڑھے کھڑے ہیں پیڑ
منظر منظر، نظر چھونے والا میں
جو کچھ ہے اس پار وہی اُس پار بھی ہے
ناؤ اب اپنی آپ ڈبونے والا میں

(25)

چاند کی اول کرن منظر بہ منظر آئے گی
شام ڈھل جانے دو شب زینہ اتر کر آئے گی
میرے بستر تک ابھی آئی ہے وہ خوشبوئے خواب
رفتہ رفتہ بازوؤں میں بھی بدن بھر آئے گی
جانے وہ بولے گا کیا کیا اور بری ہو جائے گا
کچھ سنوں گا میں تو سب تہمت مرے سر آئے گی
وہ کھڑی ہے اک روایت کی طرح دہلیز پر
سیر کا بھی شوق ہے لیکن نہ باہر آئے گی
یوں کہ تجھ سے دور بھی ہوتے چلے جائیں گے ہم
جانتے بھی ہیں صدا تیری برابر آئے گی
کیا کھڑا ندی کنارے دیکھتا ہے وسعتیں
کیا سمجھتا ہے کوئی موجِ سمندر آئے گی
کیا عجب ہوتے ہیں باطن راستوں کے سلسلے
کوئی بھی زنداں ہو باقی روشنی در آئے گی

(26)

شفق شجر موسموں کے زیور، نئے نئے سے
دعاؤں کی اوس چھنتے منظر، نئے نئے سے

نمک نشیلی گداز فصلیں، نئی نئی سی
افق پرندے، گلاب بستر، نئے نئے سے
خلا خلا بازوؤں کو بھرتی نئی ہوائیں
سفر صدف بادباں سمندر، نئے نئے سے
یہ دن ڈھلے کس کا منتظر میں نیا نیا سا
یہ پھیلتے خواب میرے اندر نئے نئے سے
خنک ہوا شام کی کہانی نئی نئی سی
پرانے غم پھر محبتوں بھر نئے نئے سے

(27)

علی بن متقی رویا
وہی چپ تھا وہی رویا
عجب آشوب عرفاں میں
فضا گم تھی کہ جی رویا
یقیں مسمار موسم کا
کھنڈر خود سے تہی رویا
اذاں زینہ اُتر آئی
سکوت باطنی رویا
خلا ہر ذات کے اندر
سُنا جس نے وہی رویا
ندی پانی بہت روئی
عقیدہ روشنی رویا
سحر دم کون روتا ہے
علی بن متقی رویا

کتابیات

آدمی نامہ: مجتبیٰ حسین، حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد، 1918

اس آباد خرابے میں: اخترالایمان، دہلی اردو اکادمی، دہلی، 2007

اردو صحافت ماضی اور حال: پروفیسر خالد محمود ڈاکٹر سرور الہدیٰ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 2012

حساب رنگ: بانی، نیشنل اکادمی، 9 انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی، اکتوبر 1976

حرفِ معتبر: بانی، 26/6، راجندر نگر، نئی دہلی، ستمبر 1971

رشتہ کلام: محسن زیدی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1978

شفق شجر: بانی، 58، پنڈارہ روڈ، نئی دہلی، نومبر 1983

غزل کا نیا منظر نامہ: شمیم حنفی، مکتبہ الفاظ، علی گڑھ، 1981

کلیات حسن نعیم: احمد کفیل مرتب، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، 2006

یادگار غالب: مولانا الطاف حسین حالی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1975

رسائل

آج کل، اپریل 1972، دسمبر 1981

ایوان اردو، دہلی ستمبر 1988

تحریک، مئی تا جولائی 1958، اکتوبر، 1975 دسمبر 1975، جولائی 1976 نومبر 1976

سہ ماہی غبارِ خاطر، اورنگ آباد، 1976
شاہراہ، مارچ 1955، جولائی 1957، نومبر 1957، اپریل 1959،
شب خون، اکتوبر تا دسمبر 1981، شب خون، 1973، مارچ اپریل 1974
فن اور شخصیت غزل نمبر، مارچ 1978
فنون، لاہور 1968

راجیندر منچندا بانی کا شمار اردو کے ممتاز ترین جدید غزل گویوں میں ہوتا ہے۔ وہ 12 نومبر 1932 کو ملتان (موجودہ پاکستان) میں پیدا ہوئے اور تقسیم ہند کی آندھی میں دلی آپہنچے۔ بانی کے والد لالہ گوبند رام منچندہ تھے جو دہلی کے ایک سرکاری اسکول میں استاد تھے۔ بانی کا انتقال صرف 48 سال کی عمر میں ہوگیا تھا۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''حرف معتبر'' 1971 میں شائع ہوا اور دوسرا 'حساب رنگ' 1976 میں اور تیسرا ''شفق سحر'' بعد از مرگ 1983 میں شائع ہوا۔ وہ اردو کے ان چند جدید شاعروں میں سے ایک ہیں جن کی آواز دور سے پہچانی جاتی ہے۔ ان کے بارے میں گوپال متل نے لکھا ہے کہ ''انھوں نے زبان و بیان کے بنیادی تقاضوں سے کہیں انحراف نہیں کیا ہے لیکن لفظوں کے برتنے کا انداز ان کا اپنا ہے۔ وہ بڑی ہنرمندی سے ایسی لفظی ترکیبیں وضع کرتے جاتے ہیں جو اچھوتی معنویت کی حامل ہوتی ہیں اور قاری کے ذہن پر اپنی شگفتگی اور تازگی کا گہرا نقش چھوڑتی ہیں۔'' جدید شعرا میں بانی کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ ان کی شاعری کا غالب میلان استعارہ سازی کی طرف ہے۔

ان پر یہ مونوگراف ڈاکٹر عمیر منظر نے تیار کیا ہے جو شعبہ اردو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی لکھنؤ سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے بانی پر ہی اپنا تحقیقی مقالہ بھی لکھا تھا۔ ان کی ایک کتاب ''مولانا ابواللیث ندوی کے قرآنی مقالات'' شائع ہوچکی ہے۔

ISBN 978-93-5160-106-7

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025

₹ 76.00